ادب کے عصری تناظرات:
انور زاہدی کے افسانوں کی فکر اور اسلوب کا مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

غلام عباس:

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۲۱ء

ادب کے عصری تناظرات:
انور زاہدی کے افسانوں کی فکر اور اسلوب کا مطالعہ

مقالہ نگار:

غلام عباس

یہ مقالہ

ایم فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۲۱ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف ایڈوانس انٹگریٹڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

ادب کے عصری تناظرات:

انور زاہدی کے افسانوں کی فکر اور اسلوب کا مطالعہ

پیش کار: غلام عباس رجسٹریشن نمبر: 1741/M/U/S19

(ماسٹر آف فلاسفی)، (اردو)

شعبہ: (اردو زبان وادب)

ڈاکٹر بشریٰ پروین صاحبہ: _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی: _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز:

پرو ریکٹر اکیڈمکس _____

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، غلام عباس حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر بشریٰ پروین صاحبہ کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

غلام عباس

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۲۱ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاع کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
مقالے کا دائرہ کار	viii
Abstract	ix
مقالے کا مقصد	xi
اظہار تشکر	xii
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	1
الف۔ تمہید	1
i. موضوع کا تعارف	1
ii. بیان مسئلہ	2
iii. مقاصدِ تحقیق	3
iv. تحقیقی سوالات	3
v. نظری دائرہ کار	3
vi. تحقیقی طریقہ کار	4
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	5
viii. تحدید	5
ix. پس منظری مطالعہ	6
x. تحقیق کی اہمیت	6
ب۔ انور زاہدی کا مختصر تعارف	7

ج۔انور زاہدی کے افسانوں کے موضوعات کا تعارف: 9
i. سماج 9
ii. سیاسی تناظرات 12
iii. تاریخ 15
iv. ثقافت 18
v. یادِ ماضی 20
vi. حوالہ جات 22
باب دوم: انور زاہدی کے افسانوں کی فکری جہات: 24
ا۔انور زاہدی کے افسانوں کا زمانی تعین 24
ب۔انور زاہدی کے افسانوں کا فکری پس منظر: 29
i. جدیدیت کا فکری آہنگ 30
ii. فرد کی بے توقیری 36
iii. عدم شناخت 42
iv. یادِ ماضی 48
v. معاشرتی ناہمواری 51
vi. ظلم بے انصافی اور بے حسی 54
vii. سیاسی عدم استحکام 57
ج۔انور زاہدی کے افسانوں کا فکری مطالعہ: 59
i. ماضی پرستی 60
ii. معاشی استحصال و عدم تحفظ 65
iii. زندگی کا عارضی پن۔ فکرِ موت 68
iv. سیاسی انتشار 72
v. نفسیاتی پیچیدگیاں 75
vi. حکومتی بدانتظامی 84

vii. حوالہ جات 87
باب سوم۔انور زاہدی کی افسانوی نثر کا اسلوب: 92
i۔علامتی انداز و علامتی طرزِ تحریر: 95
ا۔'' عذاب شہر پناہ کے افسانے'' 96
ب۔بیانیہ طرزِ تحریر: 103
i. موسم جنگ کا، کہانی محبت کی 103
ii. مندر والی گلی 106
iii. بائسکوپ دن 107
ج۔منظر نگاری 109
د۔شاعرانہ تخیل 113
ہ۔اختصار 116
حوالہ جات 120
باب چہارم: مجموعی جائزہ 123
ا۔ مجموعی جائزہ 123
ب۔ تحقیقی نتائج 132
ج۔سفارشات 134
کتابیات 135
ضمائم 138

مقالہ کا دائرہ کار

عصرِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں انور زاہدی کا نام بطور افسانہ نگار سامنے آتا ہے۔ انور زاہدی موجودہ دور کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جو کہ اپنے عہد کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریریں، ادبی اعتبار سے دقیق نقطہ نظر کی حامل ہیں۔ عصرِ حاضر میں جدید افسانہ نگاری میں فکری و اسلوبی تحقیق خاصی اہمیت کی حامل ہے اور توجہ طلب بھی ہے۔

اس مقالہ میں انور زاہدی کی مختلف فکری جہات کا تجزیہ کیا جائے گا، جس میں سماج، سیاست، یاد ماضی، تاریخ اور ثقافت کے فکری زاویوں پر بحث کی جائے گی۔ مجوزہ تحقیق میں انور زاہدی کی فکری جہات کا مطالعہ کیا جائے گا۔

کسی بھی تخلیق کار کا اسلوب کئی عناصر سے تشکیل پاتا ہے۔ جس میں بعض عناصر اس صنفِ ادب کے تقاضوں کے تحت آتے ہیں، جو تخلیق کار اختیار کرتا ہے۔ بعض عناصر اس کی شخصیت اور انفرادیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ انور زاہدی کا اسلوب اُن کے فن کو مزید تقویت بخشتا ہے۔ مجوزہ تحقیق میں انور زاہدی کے اسلوب کے نمایاں خصائص اور امتیازات کا تجزیہ کیا جائے گا۔

مقالے کے پہلے باب میں ادب کے عصری تناظرات اور فکر کے بنیادی مباحث بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں آپ کے فکری پس منظر اور فکری جہات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالے کے تیسرے باب میں انور زاہدی کے اسلوب کے نمایاں خصائص کو بیان میں لایا گیا ہے۔ چوتھے باب میں آپ کے افسانوں کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔

ADAB KY ASRI TANAZURAT:

ANWAR ZAHIDI KY AFSANO KI FIKAR AUR ASLOOB KA MUTALA

ABSTRACT

In the mythological legacy or tradition, it is believed from ages that the writers are physicians of their societies. It is debatable whether or not writers should be considered doctors. However, it can be said with degree of certainty that the writers having actual medical background are truly the salt of earth because there might not be any better training for the writer's profession than that of spending time in medicine.

Mr. Anwar Zahidi, the physician turned author is one such person. With an inherited love for literature, Zahidi is a full-time hospital physician. He is known to have written with truth, compassion, and devotion. Thus perhaps quite predictably his writing has earned him several awards.

Being a Medical Doctor, Zahidi has an added advantage and that is his ability to feel what others feel, and simultaneously to view it with detachment. This uniqueness of taking a calm, dispassionate view of the situation gives him greatest strength as writer.

Likewise all the practicing doctors, Mr. Zahidi is privileged to witness landmarks of life such as illness, ageing, bereavement, death are acted out in countless different families and lives . This is the reason he is no short of the inspiration for character and story. And it is no exaggeration to say that he portrays his characters with the objectivity of a scientist and a physician combined with the sensitivity and psychological understanding of an artist.

Another notable feature that makes Zahidi prominent among his contemporaries is the striking use of metaphors to create and convey subtle nuance of meanings. In addition, the economy of carefully chosen words, sensory details, lots of references of abandoned cities, and the beautiful flow of language all make his work an interesting read, indeed.

Dr. Zaidi's fiction work depicts the socio-political environment in the third world where injustice, corruption, nepotism, massacre and hate reigns. So, he keeps his readers profoundly affected by his stories. The readers feel emotionally associated with the familiar characters due to their relevance in day to day life.

The first chapter of my thesis provides some insight to the current trend in literature.

The second chapter sheds light on the intellectual background and literary worth of Zaidi's work especially in the context of current literary practices. The third chapter discusses the writing style and literary devices implied by the by famous physician-turned-author in his four fictions i.e, “Azab-e-Shehrpanah”, “Mosam Jang Ka, Kahani Mohabat Ki “,“ Mandir Wali Gali”, and Bioscope Din”
The last chapter gives an over-all view of fiction-writing abilities of Dr. Zahidi.

مقالے کا مقصد

انور زاہدی جدید افسانہ نگاروں میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔انور زاہدی کے افسانوں کے حوالے سے آپ کی فکر اور اسلوب کے خصائص پر ابھی تک کوئی مقالہ سامنے نہیں آیا۔اس مقالے کا مقصد جدید اردو افسانے میں انور زاہدی نے علامتی اظہار کے ذریعے اپنے فکری زاویوں سے اردو افسانے کو کیسے تقویت بخشی اور ارتقائی مراحل کے ساتھ انور زاہدی کی فکر اور اسلوب میں کون کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

جدید افسانہ نگاری میں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے اور نئے موضوعات کو افسانہ نگاری میں جگہ بھی دی گئی۔ معاشرے میں پنپنے والے مسائل، آیا کہ ان مسائل کا تعلق معاشی، سیاسی، معاشرتی، سماجی مسائل سے ہو، خاصے توجہ طلب ہیں۔ان مسائل کے علاوہ نفسیاتی مسائل پر بھی قلم اُٹھایا گیا ہے۔اس حوالے سے انور زاہدی کا نام سامنے آتا ہے۔ جنھوں نے افسانہ نگاری میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا۔اس مقالے میں انور زاہدی کے ہاں بھی معاصر صورتِ حال سمیت روایت اور جدت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے اور یہی جھلک ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ زیرِ نظر مقالے کا مقصد ان کے افسانوں کا فکری و اسلوبی مطالعہ کرنا ہے۔اس سے موجودہ دور میں انسانی رویوں سے متعلق بہت سے سوالوں کے جوابات مل سکیں گے۔

اظہار تشکر

اللہ تعالی کے ان گنت احسانات میں سے سب سے بڑا احسان جو انسان پر کیا گیا، وہ علم کی عطا ہے۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ کس قدر اس سے مستفید ہوتا ہے۔ تمام تر تعریفیں، اس پروردگار کے لیے جس کی بے پناہ عنایات اور فضل و کرم ہمیشہ میرے شامل حال رہا۔ یہ اسی ذات کا لطف و کرم ہے کہ میں اپنے ایم فل کا مقالہ "ادب کے عصری تناظرات: انور زاہدی کی فکر اور اسلوب کا مطالعہ" پیش کر پایا۔

اس مقالے کی تکمیل میں ان تمام احباب کا شکر گزار ہوں، جن کا تعاون اور دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ میرے والدین جن کے ہاتھ ہمیشہ میرے حق میں دعا کے لیے اٹھے رہتے ہیں۔ میرے الفاظ بے بس ہیں کہ کیسے تشکر کا اظہار کر پائیں۔ گھر سے سکول، سکول کے تدریسی فرائض، وہاں سے یونیورسٹی کا لمبا سفر، یونیورسٹی سے رات گئے، واپسی پر، ہمیشہ اپنے ابو جی کو گھر سے باہر سڑک پر اپنے انتظار میں ٹہلتے پایا۔ میں اس انتظار کی اک گھڑی کا بھی شکریہ بھلا کیسے ادا کر سکتا ہوں؟

اپنی فیملی کا مشکور ہوں جن کا تعاون اور تحریک میرے اس مقالے کی تکمیل میں کافی معاون و مددگار ثابت ہوئی۔ میرے معلمین دوست جن کا تعاون اور دعائیں، دوران ملازمت میرے اس تدریسی عمل میں میرے ساتھ رہیں، خصوصی طور پر سربراہ ادارہ کا تہہ دل سے مشکور ہوں، جنہوں نے ہمیشہ میرے لئے آسانیاں پیدا کیں۔

اس عالمی وبا کرونا وائرس کے پیش نظر کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، موضوع کا چناؤ اور تحقیقی مواد کی جمع آوری، پے در پے لاک ڈاؤن، یقیناً ایک مشکل دور تھا۔ میں تہہ دل سے اپنے تمام اساتذہ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، جن کی محبت و شفقت ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ نگران مقالہ، ڈاکٹر بشری پروین صاحبہ نے اس مقالے کی تکمیل میں خصوصی معاونت فرمائی اور قیمتی آراء سے مستفید فرمایا۔ اللہ پاک آپ کو جزائے خیر دے۔

ان تشکر آمیز جذبوں کے اظہار میں ڈاکٹر انور زاہدی صاحب کا نام کیسے بھول سکتا ہوں، صاحب موضوع شخصیت نے تحقیق طلب امور پر ہمیشہ رہنمائی فرمائی۔ اپنی خرابی صحت کے باوجود ہمیشہ خندہ پیشانی سے میری زحمت کو زحمت نہ سمجھا۔ ان لائبریریوں کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں، جنہوں نے ہمیشہ مجھے خوش آمدید کہا۔

نذیر لائبریری نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

لائبریری علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

پی۔او۔ایف سینٹرل لائبریری، واہ کینٹ

ان تمام لائبریریوں کے سٹاف کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے عملی تعاون کی بدولت مشکل مرحلے میرے لیے آسان بنتے چلے گئے۔

غلام عباس

دسمبر ۲۰۲۱ء

باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف:

زیر نظر مقالے کا موضوع انور زاہدی کے افسانوں کا فکری و اسلوبی مطالعہ ہے۔ انور زاہدی کا تعلق اسلام آباد سے ہے۔ علمی و ادبی گھرانے سے وابستہ ہیں۔ انور زاہدی علمی و ادبی حلقے میں اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں ۔ آپ نے ادب کے ہر پہلو میں طبع آزمائی کی۔ افسانہ نگاری میں بھی اپنا منفرد مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی کے ۷۰، ۸۰ اور ۹۰ کے عشروں میں سانحہ مشرقی پاکستان، پھر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت، خاتمے، ان کی پھانسی اور اس کے بعد مارشل لاء کے لمبے دورانیے کی بنیاد پر مختلف ادبی حلقوں میں ادباء نے نہ صرف غم اور غصے کا اظہار کیا بلکہ علامت اور تجرید کا سہارا لیتے ہوئے شاعری اور نثر میں بہت کچھ تحریر کیا۔ یہی سیاسی عدم استحکام، داخلی ناآسودگی، عدم تحفظ، بے یقینی، بے اعتمادی، جدیدیت اور سماج کے کرب جیسے عوامل انور زاہدی کی فکری تشکیل کا باعث بنے۔ اس ترقی نے جہاں سماجی فاصلوں کی حد بندیوں کو پاش پاش کر دیا، وہاں رشتوں کی پامالی، تنہائی، بے یقینی سے فرد کو مزید مایوس اور تنہا کر دیا۔ ماضی کی یادیں اور حال سے ان کا تقابل ادیب کو قلم اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ اور قاری کو امید دلاتا ہے۔

انور زاہدی کے افسانے ارتقائی مراحل گزرنے کے ساتھ ساتھ فکری و اسلوبی لحاظ سے موضوعات کے تنوع اور عصری رجحانات کا تحریری ثبوت ہیں۔ اپنے پہلے مجموعے میں انور زاہدی نے علامت اور تجرید کا سہارا لیا اور عصر حاضر کے موضوعات کو قلم بند کیا.

۱۹۹۰ء اور مابعد کے دور میں ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ، ایٹمی دھماکوں اور عالمی سطح پر ابھرنے والی تخریب کاری کی لہر نے پوری دُنیا کے انسانوں کو مزید متفکر اور نالاں کر دیا۔ انور زاہدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ دقیق فکر اور مشاہداتی گہرائی نے ان کے کام کو مزید دلفریب اور پُر تاثیر بنا دیا ہے۔

انور زاہدی کے افسانے اپنے عہد کے کرب کا تجریدی اور علامتی اظہار ہیں۔ انور زاہدی کے فکری زاویے، اسلوب کی جدت اور اُن کا نقطہء نظر، معاشرے کے مسائل کا عکاس ہے۔ انور زاہدی نے اپنے افسانوں میں بیانیہ طرزِ تحریر کے علاوہ علامتی اور تجریدی طرزِ تحریر کو بھی اپنایا۔ یہی اسلوب انور زاہدی کے افسانوں کی پہچان بنا۔ درج ذیل افسانوی مجموعے انور زاہدی کی افسانہ نگاری کے فن کے عکاس ہیں۔

ا۔ عذابِ شہر پناہ ۱۹۹۱ء

۲۔ موسم جنگ کا کہانی محبت کی ۱۹۹۷ء

۳۔ مندر والی گلی ۲۰۰۷

۴۔ بائسکوپ دن ۲۰۱۳ء

ii۔ بیان مسئلہ :

مجوزہ موضوع کے حوالے سے دیکھا جائے گا کہ جدید اردو افسانے میں انور زاہدی نے علامتی اظہار کے ذریعے اپنے فکری زاویوں سے اردو افسانے کو کیسے تقویت بخشی اور ارتقائی مراحل کے ساتھ انور زاہدی کی فکر اور اسلوب میں کون کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انور زاہدی نے اپنے افسانوں میں علامت نگاری کو کیسے استعمال کیا۔ جدید افسانہ نگاری میں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے، اور نئے نئے موضوعات کو افسانہ نگاری میں جگہ بھی دی گئی۔ یادِ ماضی کو بھی موضوع بنایا گیا۔ معاشرے میں پنپنے والے مسائل، آیا کہ ان مسائل کا تعلق معاشی، سیاسی، معاشرتی، سماجی مسائل سے ہو، خاصے توجہ طلب ہیں۔ ان مسائل کے علاوہ نفسیاتی مسائل پر بھی قلم اُٹھایا گیا ہے۔ اس حوالے سے انور زاہدی کا نام سامنے آتا ہے۔ جنھوں نے افسانہ نگاری میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا۔ انور زاہدی کے ہاں بھی معاصر صورتِ حال سمیت روایت اور جدت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے اور یہی جھلک ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ اس لیے زیرِ نظر مقالے میں ان کے افسانوں کا فکری و اسلوبی مطالعہ کیا جائے گا۔ اس سے موجودہ دور میں انسانی رویوں سے متعلق بہت سے سوالوں کے جوابات مل سکیں

گے۔ضرورت ہے کہ انور زاہدی کے افسانوں میں اُن کی فکری جہات کیسے ان کے منفرد اسلوب کو جنم دیتی ہیں اور انور زاہدی کو جدید افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔

iii۔ مقاصد تحقیق:

۱۔ انور زاہدی کے افسانوں میں ان کے فکری مباحث کو زیرِ بحث لانا۔

۲۔ ارتقائی مراحل اور ادبی رجحانات کے زیر اثر انور زاہدی کے اسلوب میں تبدیلی اور جدت کو زیر بحث لانا۔

۳۔ اس امر کی وضاحت کرنا کہ انور زاہدی کے ہاں موضوعات کا تنوع ان کے فکری زاویوں کا عکاس ہے۔

iv۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ ایسے کون سے عوامل ہیں جو کہ انور زاہدی کے افسانوں کے ارتقائی مراحل میں فکری حوالے سے جدت کا باعث بنے ہیں؟

۲۔ عصر حاضر میں انور زاہدی کیسے فرد کی صورتحال پر حال کا ماضی سے تقابل کرتے ہیں۔؟

۳۔ انور زاہدی کا اسلوب کن وجوہات کی بدولت علامتی و تجریدی افسانے سے بیانیہ طرزِ تحریر کی طرف مائل ہوا۔اور انور زاہدی کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

v۔ نظری دائرہ کار:

ڈاکٹر انوار احمد کے مطابق معاشرتی زندگی ادب، مذہب، معیشت، معاشرت اور سیاست کے ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے، لیکن ان میں سیاست، سماجی زندگی پر ہر لحاظ سے اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔انور زاہدی کی فکر کا ایک اہم عنصر سیاسی فکر ہے جو کہ سماجی، معاشرتی، معاشی اور مذہبی فکر کو جنم دیتی ہے۔سیاسی عدم استحکام آمریت، فرد کے اظہارِ خیال پر پابندی کا باعث تو ہے ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ جبر و تشدد کو عروج پر پہنچانے کی

ایک قوی وجہ بھی ضرور ہے اور انسانی فکر کو متاثر کرتی ہے۔ عالمی و ملکی صورتحال، بے یقینی، معاشی جبریت ،افلاس، عدم تحفظ، عدم شناخت، فرد کی بے توقیری وغیرہ، یہ وہ تمام عوامل ہیں جو کہ حال سے بیزاری کا باعث بنتے ہیں۔ایسے میں ادیب یاد ماضی کا سہارا لے کے عصر حاضر کے انسان کو امید دلاتا ہے۔اور یہ فکر مصنف کی فکری تشکیل کا باعث بھی بنتی ہے۔

مجوزہ مقالے میں انور زاہدی کے مختلف فکری زاویوں کا تجزیہ کیا جائے گا، جس میں سماج، سیاست، یاد ماضی، تاریخ اور ثقافت کے فکری زاویوں پر بحث کی جائے گی۔ مجوزہ تحقیق میں انور زاہدی کی فکری جہات کا مطالعہ کیا جائے گا۔

کسی بھی تخلیق کار کا اسلوب کئی عناصر سے تشکیل پاتا ہے۔ جس میں بعض عناصر اس صنفِ ادب کے تقاضوں کے تحت آتے ہیں، جو تخلیق کار اختیار کرتا ہے۔ بعض عناصر اس کی شخصیت اور انفرادیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ انور زاہدی کا اسلوب اُن کے فن کو مزید تقویت بخشتا ہے۔ مجوزہ تحقیق میں انور زاہدی کے اسلوب کے نمایاں خصائص اور امتیازات کا تجزیہ کیا جائے گا۔

فکری حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم کی تصنیف ''اُردو افسانہ'' اور اسلوبی مطالعے کے لیے سید عابد علی عابد کی کتاب، اسلوب'' اسلوب اور اسلوبیات'' از طارق سعید اور '' اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات'' از ڈاکٹر فوزیہ اسلم سے استفادہ کیا جائے گا۔

vi۔ تحقیق کا طریقہ کار:

۱۔ اس موضوع پر تحقیق کے لیے پہلے سے موجود تحقیقی مواد سے مدد لی جائے گی ، تحقیقی مقالے کے لیے دستاویزی طریقہ اختیار کیا گیا۔

۲۔ مصنف کی اپنی تخلیق کردہ کتابوں کو بطور بنیادی مآخذ استعمال کیا جائے گا۔

۳۔ عصرِ حاضر کے ادبی مجلوں اور جریدوں میں ان کے فن، فکر اور ادبی خدمات کے

سلسلے میں تحقیقی و تنقیدی مضامین سے مدد لی جائے گی۔

۴۔ دیگر کتب خانوں سے تحقیقی کام کے دوران شواہد کی جمع آوری کو ممکن بنایا جائے گا۔

۵۔ اہم ادبی شخصیات اور مصنف کی آراء کو بھی شاملِ مقالہ کیا جائے گا۔

۶۔ فکری واسلوبی مطالعہ کے حوالے سے تحقیقی مقالہ جات سے بھی مدد لی جائے گی۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

عصرِ حاضر میں انور زاہدی کی شخصیت اپنی ادبی خدمات کی بدولت ادبی حلقے میں کافی مقبول ہے۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز میں ان کی شخصیت کے حوالے سے ایم اے کی سطح پر کام ہو چُکا ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ۲۰۱۱ء میں اسکالر ''عجب خان'' نے ''**ڈاکٹر انور زاہدی کی ادبی خدمات**'' کے عنوان سے ایم فل کی سطح پر تحقیقی کام ''ڈاکٹر محسنہ نقوی'' کی نگرانی میں سرانجام دیا، لیکن انور زاہدی کے افسانوں پر اور خصوصاً ان کے افسانوں کے فکر و اسلوب کے حوالے سے اس سے قبل کام نہیں ہوا۔ محقق نے صرف بیسویں صدی میں شائع ہونے والے مجموعوں کا تعارف پیش کیا ہے۔ اور اختصار کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ انور زاہدی کی افسانوی نثر کے اسلوب کے حوالے سے موضوع تحقیق طلب ہے۔

viii۔ تحدید:

اس مقالے میں انور زاہدی کے افسانوی مجموعوں کا جائزہ لیا جائے گا اور ان کے افسانوں کا فکری واسلوبی حوالے سے تجزیہ کیا جائے گا۔ موضوعات، اور ان کے رجحانات کو پرکھا جائے گا۔ مصنف کی دیگر کتب اور شاعری کے تراجم، سفر نامہ، تحقیق و تنقید مجوزہ مقالے میں شامل نہیں ہیں۔

ix۔ پس منظری مطالعہ :

انور زاہدی کی کتب پر کیے گئے تبصروں اور تحریر کردہ مضامین کا مطالعہ کیا گیا۔ اور اس کے علاوہ جدید اردو ادب میں اور خصوصاً افسانہ نگاری میں فکری و اسلوبی حوالے سے دستیاب کتب سے بھی معاونت حاصل کی گئی۔ موضوع سے متعلقہ کتب کو بھی شاملِ تحقیق کیا گیا۔ **"انور زاہدی کی ادبی خدمات"** مقالے میں محقق نے صرف پہلے دو مجموعے شامل کیے ہیں۔ افسانوں کے مختصر تعارف پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ فکری اور اسلوبی حوالے سے کوئی تحقیقی کام نہیں کیا گیا ہے۔ اسلوبی مطالعہ کے لئے، ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی کتاب "اردو افسانے پر اسلوب اور تکنیک کے تجربات" سے مدد لی جائے گی۔ ڈاکٹر انوار احمد کی کتاب " اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ "اور ڈاکٹر سلیم آغا کی کتاب " جدید اردو افسانے کے رجحانات "کا مطالعہ کیا گیا۔

x۔ تحقیق کی اہمیت :

کسی بھی خطے میں تخلیق ہونے والے ادب پر اس وقت کے سیاسی و سماجی واقعات کا اثر ضرور مرتب ہوتا ہے۔ ادب کسی بھی معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے اور معاشرے سے جڑے مسائل اور حالات و واقعات ادیب کو ضرور متاثر کرتے ہیں۔ ادیب معاشرے سے جڑے افراد کی ترجمانی کرتا ہے۔ اردو افسانہ نگاری میں ہمارے سامنے بہت بڑے بڑے افسانہ نگار آتے ہیں جن میں پریم چند، کرشن چندر، سجاد ظہیر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، منشایاد اور دورِ حاضر کے جدید افسانہ نگار شامل ہیں۔ جنھوں نے اپنے دور کے مسائل سے پردے اٹھائے اور معیاری ادب تخلیق کیا۔ اپنے عہد کے ہر طبقے کے مسائل پر قلم اٹھایا۔ اسی حوالے سے عصرِ حاضر میں افسانہ نگار انور زاہدی کا نام سامنے آتا ہے۔ اسی طرح انور زاہدی موجودہ دور کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جو کہ اپنے عہد کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریریں ادبی اعتبار سے دقیق نقطہ نظر کی حامل ہیں۔ عصرِ حاضر میں جدید افسانہ نگاری میں فکری و اسلوبی تحقیق خاصی اہمیت کی حامل اور توجہ طلب بھی ہے۔

ب۔انور زاہدی کا مختصر تعارف:

زیر نظر مقالے کا موضوع انور زاہدی کے افسانوں کا فکری واسلوبی مطالعہ ہے۔سید انور مقصود زاہدی ادبی دنیا میں انور زاہدی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔آپ ۹جولائی ۱۹۴۶ء کو مری روڈ،راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد گرامی کا نام سید مقصود زاہدی ہے۔آپ کے والد سید مقصود زاہدی ادبی حلقے میں مختلف اصناف ادب میں بطور شاعر اور نثر نگار خاصے مقبول تھے۔ڈاکٹر انور سدید اپنے مضمون "مقصود زاہدی ۔۔۔شخصیت کے چند پہلو" میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''اردو ادب میں سید مقصود زاہدی تنوع،ضبط اور توازن کی مثال ہیں۔ان کے ہاں تنوع موضوعات کا ضبط ہیئت کا اور توازن اظہار کا ہے۔یہ طلائی ترپھلا ان کے افسانوں اور خاکوں میں بھی ظاہر ہوتا ہے ۔۔۔اور ان کی شاعری بلخصوص رباعیات سے بھی منعکس ہوتا ہے۔''(۱)

آپ کی شخصیت علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھی۔ادبی ذوق کے ہمراہ آپ شعبہ طب سے وابستہ ہوئے۔مختلف ہسپتالوں میں بطور ڈاکٹر اپنی خدمات پیش کیں۔انور زاہدی علمی وادبی حلقے میں اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ڈاکٹر شفیق انجم انور زاہدی کی کہانیوں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انور زاہدی کو پڑھا تو کہانی کے معاصر چلن کے مقابلے میں ایک مختلف تازگی کا احساس ہوا۔ان کی کہانیوں کا رومانس مختلف ہے۔زندگی اور وقت کی تفہیم اور اس کی تہ داری مختلف ہے۔احتجاج،بغاوت اور محبت کے زاویے جداگانہ ہیں۔۔۔اس کہانی کار کے ساتھ کچھ وقت نہیں بہت سارا وقت گزارا جاسکتا ہے۔''(۲)

آپ نے ادب کے ہر پہلو پر طبع آزمائی کی۔افسانہ نگاری میں بھی اپنا منفرد مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔بیسویں صدی کے ۷۰،۸۰ اور ۹۰ کے عشروں میں سانحہ مشرقی پاکستان،پھر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت، خاتمے،ان کی پھانسی اور اس کے بعد مارشل لاء کے لمبے دورانیے کی بنیاد پر مختلف ادبی حلقوں میں ادباء نے نہ صرف غم اور غصے کا اظہار کیا بلکہ علامت اور تجرید کا سہارا لیتے ہوئے شاعری اور نثر میں بہت کچھ تحریر کیا۔یہی

سیاسی عدم استحکام، داخلی ناآسودگی، عدم تحفظ، بے یقینی، بے اعتمادی، جدیدیت اور سماج کے کرب جیسے عوامل انور زاہدی کی فکری تشکیل کا باعث بنے۔

اس ترقی نے جہاں سماجی فاصلوں کی حد بندیوں کو پاش پاش کر دیا، وہاں رشتوں کی پامالی، تنہائی، بے یقینی نے فرد کو مزید مایوس اور تنہا کر دیا۔ ماضی کی یادیں اور حال سے ان کا تقابل ادیب کو قلم اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ اور قاری کو امید دلاتا ہے۔

انور زاہدی کے افسانے ارتقائی مراحل طے کرنے کے ساتھ ساتھ فکری واسلوبی لحاظ سے موضوعات کے تنوع اور عصری رجحانات کا تحریری ثبوت ہیں۔

اپنے پہلے مجموعے میں انور زاہدی نے علامت اور تجرید کا سہارا لیا اور عصر حاضر کے موضوعات کو قلم بند کیا۔ ۱۹۹۰ء اور مابعد کے دور میں ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ، ایٹمی دھماکوں اور عالمی سطح پر ابھرنے والی تخریب کاری کی لہر نے پوری دُنیا کے انسانوں کو متفکر اور نالاں کر دیا۔ انور زاہدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ دقیق فکر اور مشاہداتی گہرائی نے ان کے کام کو مزید دلفریب اور پُر تاثیر بنا دیا ہے۔

انور زاہدی کے افسانے اپنے عہد کے مظالم اور کرب کا علامتی اظہار ہیں۔ انور زاہدی کے فکری زاویے، اسلوب کی جدت اور اُن کا نقطہ ء نظر، معاشرے کے مسائل کا عکاس ہے۔ انور زاہدی نے اپنے افسانوں میں بیانیہ طرزِ تحریر کے علاوہ علامتی اور تجریدی طرزِ تحریر کو بھی اپنایا۔ یہی اسلوب انور زاہدی کے افسانوں کی پہچان بنا۔ درج ذیل افسانوی مجموعے انور زاہدی کی افسانہ نگاری کے فن کے عکاس ہیں۔

۱۔ عذابِ شہر پناہ۔ ۱۹۹۱ء

۲۔ موسم جنگ کا کہانی محبت کی۔ ۱۹۹۷ء

۳۔ مندر والی گلی۔ ۲۰۰۷ء

۴۔ بائسکوپ دن۔ ۲۰۱۳ء

انور زاہدی کی شخصیت اور ان کے فن سے متعلق ممتاز مفتی اپنے ایک خاکے میں یوں ذکر کرتے ہیں:

> ''اگر آپ ڈاکٹر انور زاہدی کو جاننا چاہتے ہیں تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس سے ملئے نہیں بلکہ اسے پڑھئے۔ کچھ شخصیتیں حلوائی کی دکان کی طرح ساری کی ساری

باہر دھری ہوتی ہیں۔ کچھ فیصل مسجد کی طرح ہوتی ہیں۔ باہر ایک رو کھا پھیکا تنا ہوا خیمہ ہوتا ہے جسے دیکھ کر پتہ نہیں چلتا کہ اندر رنگ رس کا میلہ لگا ہوا ہے۔"(۳)

ج۔انور زاہدی کے افسانوں کے موضوعات کا تعارف

i۔ سماج:

علمی اردو لغت کے مطابق "سماج" کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے۔ "معاشرہ، سوسائٹی، انجمن، کمیٹی، محفل، گروہ، جتھا، ٹولی یا منڈلی"(۴)

قومی انگریزی اردو لغت میں سماج کی تعریف ان الفاظ میں ملتی ہے:

"معاشرہ سماج، سوسائٹی، رفاقت، سنگت، لوگوں کا گروہ، جو کسی مشترکہ مقصد کے لیے باہم متحد ہو، خصوصاً ادبی، سائنسی، سیاسی، مذہبی، فلاحی مقاصد یا شادمانی وغیرہ کے لئے افراد کا ربط و ضبط، جیسے قوم جو باہمی مفاد اور تحفظ کی بنا پر منظم ہو، حیوانات یا نباتات کا وہ گروہ جو انحصار باہمی کے تحت مل کر رہتا ہے۔"(۵)

وکی پیڈیا کے مطابق:

"سماج لفظ سنسکرت زبان کے دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ "سم" اور "آج" سم کے معنی ہیں اکٹھا یا ایک ساتھ اور آج کا مطلب ہے رہنا، یعنی سماج کے لغوی معنی ایک ساتھ رہنا کے ہیں۔ اس خیال سے جہاں افراد ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں، وہیں سماج بن جاتا ہے۔ گروہ، مشترکہ ہونے کی حالت، سماج، مشترکہ ملکیت خوشی، ذمہ داری وغیرہ، مشترکہ کردار، شناخت، میل جول، دوسروں کے ساتھ مشترک زندگی، ایک ہونے کے قوانین واحکام کے تحت ہونے کے باعث، لوگوں کی جماعت سازی۔"(۶)

سماج افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ سماج کسی جامد چیز کا نام نہیں بلکہ یہ مسلسل تغیر پذیر رہتا ہے۔ ہر سماج کی اپنی منفرد روایات، نظریات اور افکار ہوتے ہیں۔ جن کی بنیادوں پر سماج اپنا وجود برقرار رکھتا ہے۔ سماج کا براہِ راست تعلق افراد سے ہے۔ افراد مختلف رشتوں اور واسطوں کے ذریعے آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔ یہ رشتہ مذہبی سیاسی، ادبی، معاشرتی اور معاشی لحاظ سے افراد کے مابین پروان چڑھتا ہے۔ معاشرے کے افراد جس قدر

محبت، خلوص اور سکون کی زندگی گزاریں گے، اتنا ہی سماج ترقی کی طرف بڑھے گا اور مثبت فکری رجحانات کو فروغ حاصل ہو گا۔

سماج کے مختلف منفی اور مثبت پہلوؤں پر لکھنا، تحقیق کے بغیر ممکن نہیں، تحقیق ہی وہ ذریعہ ہے جس کی بدولت حالات و واقعات، فکر اور جذبات کی مختلف جہتیں آشکارا ہوتی ہیں۔ بطور افسانہ نگار، انور زاہدی بھی سماج کو اپنا موضوع بناتے ہیں بلکہ اس سماج کے مثبت و منفی پہلو اپنے قارئین کے سامنے اجاگر کرتے ہیں۔

انور زاہدی کے مطابق اگر سماج کا عصری تغیر و تبدل مثبت ہو تو سماج ایک متوازن سماج کہلائے گا اور اس میں منفی روایات اور رویے فروغ پائیں گے تو ایسا سماج غیر متوازن اور زوال پذیر تصور ہو گا۔ اجتماعی سطح پر مختلف رویے، معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں اور اسی بنا پر کسی معاشرے کی اصلی و حقیقی حیثیت کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایم وائی خان اس حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

> "بد قسمتی سے ہمارے ہاں منفی سماجی رویے دن بدن اپنی جڑیں مضبوط کر کے روایات کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ جس کے باعث ہمارے معاشرے کا حسن و توازن بگڑ گیا ہے، ان کی اصلاح اور تبدیلی کے بغیر ایک پر امن متوازن، مستحکم اور منصفانہ معاشرے کا قیام ناممکن ہے۔"(۷)

انور زاہدی کے افسانوں میں سماجی ناہمواریوں کا بیان واضح انداز میں نظر آتا ہے۔ سماجی حقیقت نگار کی حیثیت سے انور زاہدی دیگر افسانہ نگاروں کی صف میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ زندگی کی حقیقتوں کو ایک نئے انداز سے اور منفرد زاویوں سے سامنے لاتے ہیں۔ یہ انفرادی انداز آپ کی فکری گہرائی اور عمیق مشاہدے کا پتا دیتا ہے۔ شہزاد منظر جدید افسانہ نگاروں کے اسی انداز سے متعلق رقمطراز ہیں:

> ''جدید افسانہ نگاروں کا زندگی اور اس کے مسائل سمجھنے اور اسے پرکھنے کا انداز فطری ہے۔ اس لیے انہوں نے صنعتی دور کے انسان کی معاشی بدحالی اور سماجی پسماندگی کے مقابلہ میں اس کی فکری اور جذباتی ناآسودگی انسان کی داخلی شخصیت کے بکھراؤ، اقدار کی شکست و ریخت، صنعتی معاشرے میں انسان کی تنہائی نیز زندگی کی معنویت اور ذات کی تلاش جیسے موضوعات کو اہمیت دی۔''(۸)

انور زاہدی سماجی رویوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں کیونکہ یہ سماجی رویے، معاشرتی حالات کا نتیجہ اور ان کی حقیقی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ معاشرتی حالات کو سمجھنے اور حقیقی حالات تک رسائی کے لیے سماجی رویوں پر غور و فکر ضروری ہے۔ مصنف عصری سماجی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے منفی سماجی رویوں کی حوصلہ شکنی اور مثبت سماجی رویوں کے فروغ کے لیے اپنے قارئین کو قائل کرتے ہیں، تاکہ وہ اصلاح معاشرہ میں اپنا انفرادی و اجتماعی کردار ادا کر سکیں۔

نسلی و قبیلائی تعصبات اس معاشرے میں معاشرتی و معاشی تقسیم کا باعث بنتے ہیں۔ مصنف نسل، قبیلے اور ذات کی اس تقسیم کو سماج کا وہ ناسور سمجھتے ہیں، جو تمام برائیوں اور حد بندیوں کو فروغ دیتی ہے۔ ذاتوں اور قبیلوں کی یہ برتری اور ان کا تقابل معاشرے کو مختلف طبقات میں تقسیم کرتا ہے۔ مصنف کے مختلف افسانوں میں ان تعصبات کا ذکر ملتا ہے، جن میں "قصہ درد کی رات کا""بے انجام کہانی"، "ماتم بال و پر کا"، "گلیوں میں گم"، "ایک ایکسٹرا کہانی" اس حوالے سے اہم افسانے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ہر گلی کا یہی مزاج ہے، ہر شخص اپنے حال میں مگن، کسی دوسرے سے کوئی سروکار نہیں۔ ہر سیکٹر دوسرے سیکٹر کے بارے میں تعصبات کا شکار، ہر محلہ دوسرے محلے کے بارے میں شک میں مبتلا ہر شخص گریڈ میں بٹا ہوا۔ ہر ذِی روح کو بڑائی کا کمپلیکس۔''(۹)

اکثر سماجی مسائل جنہیں غیر اہم سمجھا جاتا ہے اور انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اصل میں یہی مسائل سماجی بگاڑ کی وجہ بنتے ہیں۔

ضعف الاعتقادی و توہم پرستی ایسے ہی مسائل ہیں، جن کی طرف اہل دانش توجہ کم ہی دیتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک توہم پرستی اور ضعف الاعتقادی ذہنی پسماندگی کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ چوں کہ دوران پریکٹس مصنف کو ایسے بے شمار مریضوں سے واسطہ پڑا جو کہ ذہنی عارضے میں مبتلا تھے۔ آپ کے کئی افسانے اسی موضوع سے متعلق ہیں جن میں انہونی کا خوف، کسی واقعے کے وقوع پذیر ہونے سے قبل اس کا اشارہ ملنا، ایک ما بعد الطبیعاتی فضا اور پر سراریت کو جنم دیتے ہیں۔ "شفٹنگ"، "علم غیب"، "بے کار کا قصہ"، "زحال مستی"، "طائر شب" جیسے افسانے شامل ہیں۔ افسانہ شفٹنگ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مجھے کل کا ہونے والا حادثہ یاد آرہا تھا۔۔۔ کیا شیشے کا ٹوٹنا در حقیقت کوئی برا شگون ہوتا ہے۔ کیا واقعی ہر ہونے والی بات سے کوئی اور بات جڑی ہوتی ہے۔ جس کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔۔۔ یا کبھی ہمیں علم ہو جاتا ہے۔"(۱۰)

عوام کی معاشی بنیادوں پر تقسیم بھی ایک سماجی مسئلہ کے طور پر سامنے آتی ہے، اس تقسیم کی وجہ سے آپس میں فاصلوں کا اس قدر بڑھ جانا کے پورا معاشرہ شدید نفرت، بے انصافی اور تضاد کا شکار ہوا چاہتا ہے۔ طبقاتی تفریق ایک عصری حقیقت ہے، مصنف اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اپنے افسانے "گلیوں میں گم" میں لکھتے ہیں:

"یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ہمارے ہاں دو طرح کے طبقات پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو نہوتی کا شکار رہتے ہیں اور ساری عمر اسی نہوتی میں وقت گزار دیتے ہیں، جیسے کوئی آنکھیں بند کر کے زندگی کے دن کاٹ دے۔۔۔ ہاں ایک دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو خواب نہیں دیکھتے۔۔۔ ہمہ وقت اپنے اسٹیٹس کو ٹھیک کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ یہ عام طور پر مڈل کلاس کے لوگ ہوتے ہیں جو کم و بیش مڈل کلاس سے اپر کلاس میں جانے کے خواب ساری عمر دیکھتے رہتے ہیں۔"(۱۱)

ii۔ سیاسی تناظرات:۔

سماج جب شکست وریخت کا شکار ہوتا ہے، تب اس کے اثرات کسی مخصوص شعبے پر نہیں پڑتے بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ جہاں سماج کی اس گراوٹ نے دیگر شعبوں کو متاثر کیا وہیں سیاست پر بھی اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔ پاکستان کا سیاسی نظام قیام پاکستان سے ہی عدم استحکام کا شکار رہا۔ سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ اس معاشرے کے افراد نے اسے قبول بھی کر لیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مبارک علی رقمطراز ہیں:

"یہی صورتحال ہماری سیاست کی ہے ہم کسی آمرانہ دور کو برداشت کر رہے ہیں تو کبھی سیاستدانوں کی بدعنوانیاں کو۔۔۔ لہذا ہم دونوں صورتوں میں اپنی پسماندگی اور عدم استحکام کو تسلیم کر لیتے ہیں۔"(۱۲)

پاکستان اگرچہ ایک جمہوری ملک ہے۔ دستور میں ہر فرد کی بنیادی حقوق کی ضمانت تو ملتی ہے مگر صورتحال اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ سیاسی ادارے اور سیاسی جماعتیں عدم استحکام کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں حکومتوں کا تبدیل ہونا آئے دن کی بات ہے۔ اگر کوئی سیاسی جماعت اپنا عرصہ پورا کر بھی جائے تو اقتدار کی منتقلی پرامن طریقوں کی بجائے بدامنی کا شکار ہوتی ہے۔

سیاست کا براہ راست اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا ہے۔ پورا سماج سیاسی صورتحال کی بدولت ترقی یا تنزلی کا شکار ہوتا ہے۔ کسی خطہ ارض کے سیاسی حالات کا اثر وہاں پر تخلیق کیے جانے والے ادب پر بھی پڑتا ہے۔ سیاسی حالات وواقعات تخلیق کیے جانے والے ادب پر اپنی گہری چھاپ چھوڑتے ہیں۔ یہاں کی سیاسی صورتحال میں عدم استحکام اور آمریت کے مختلف ادوار کے حوالے سے ہر ادیب کے ہاں یہ موضوع کسی نہ کسی انداز میں ضرور ملتا ہے۔ پاکستان کی سیاسی صورتحال کے متعلق صبا اکرام لکھتے ہیں:

> ”آمریت کے دور میں جب عوام اور ان کی آواز کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور طاقت کی آواز اپنی تمام منفی قوتوں کے ساتھ ایک چنگھاڑ کی صورت میں ابھرتی ہے اور آمریت کی آمد کا اعلان کرتی ہے۔ یہ اعلان ہم نے کئی بار سنا ہے۔ اس کے بعد سیاسی جبریت اور استحصال کا ایک سلسلہ شروع ہوتے بھی ہمارے گناہ گار آنکھوں نے کئی بار دیکھا ہے۔“(۱۳)

پاکستان سے تعلق رکھنے والے جدید افسانہ نگاروں نے سیاسی منظر نامے کو بیان کیا ہے۔ ہر افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں سیاسی عدم استحکام اور سیاسی انتشار کو اپنا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر رشید امجد انہی سیاسی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”پاکستان کی تاریخ میں ایک بڑا واقعہ ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء ہے۔ اس فوجی انتظام حکومت نے ادب کو بالعموم اور افسانے کو بالخصوص متاثر کیا۔ اسی مارشل لاء کے خلاف احتجاج کی ایک شدید لہر اٹھی، جب آزادی اظہار پر پابندی لگی تو افسانے میں نئی نئی علامتوں، استعاروں اور تجرید کے نئے تجربے سامنے آئے۔ مزاحمتی ادب اور علامتی ادب ارتقاء پذیر ہوا۔“(۱۴)

مختلف آمرانہ طاقتوں اور عصری جبریت کے خلاف، مزاحمتی آواز بلند کرنے والوں میں انور زاہدی کا نام بھی سامنے آتا ہے۔ آمریت اور آمرانہ دور کا یہ کرب زندگی پر ایک تاریک رات کی صورت میں مختلف

واہموں اور وسوسوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ آمریت کے مختلف ادوار، سانحہ مشرقی پاکستان، پاک بھارت جنگیں، دہشت گردی کے خلاف مزاحمت، یہ سب موضوعات آپ کے افسانوں کا حصہ ہیں۔ مختلف مارشل لاؤں کا تقابل کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید امجد اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

> "ضیاء اور مشرف کے مارشل لاؤں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ضیاء دور میں مارشل لاء کا جبر ذہنی سطح پر موجود تھا۔ سرعام کوڑوں کی سزائیں، سیاسی کارکنوں کی پکڑ دھکڑ اور ان پر اٹک اور لاہور قلعوں میں تشدد، دانشوروں سے غیر انسانی سلوک نے ملک کی مجموعی فضا میں جو خوف و ہراس پیدا کیا تھا، اسکے اثرات ہر طرف دکھائی دیتے تھے، لیکن مشرف کے مارشل لاء میں اس طرح کی ظاہری صورتیں موجود نہ تھیں۔"(۱۵)

سیاسی حالات میں ابتری نے گھٹن، عدم تحفظ، کرب، بے یقینی، افسردگی و مایوسی، اکتاہٹ جیسے رویوں کو فروغ دیا۔ ان سب کیفیات نے انسانی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ اثرات معاشرے کی سب سے حساس طبقے یعنی ادباء نے بھی قبول کیے اور اس ساری صورتحال کے خلاف الم بغاوت بلند کیا۔ پابندیوں کی بدولت ان کا انداز بیان علامتی و استعاری شکل اختیار کرتا گیا۔ ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق:

> "ہر طرح کی جبریت اور دیگر غیر جمہوری رویوں اور عدم مساوات نے فرد اور اجتماع کی جو نفسیات مرتب کی ہے، اس میں سمت کے گم ہو جانے کا احساس بہت نمایاں ہے۔ اس شکست و ریخت کا اظہار کبھی بیانیہ کبھی علامتی اور کبھی استعاری رہا ہے۔"(۱۶)

"عذاب شہر پناہ" انور زاہدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ شہر پناہ کے عذاب پر مبنی کہانیوں کا یہ مجموعہ اسی کرب، بے یقینی، ناامیدی اور سماجی مسائل پر مشتمل ہے، جس سے عصر حاضر کے انسان کو سامنا ہے۔ اس بارے میں آپ خود لکھتے ہیں:

> "نظمیں لکھنے کا وقت آیا تو دن سنہری تھے۔۔۔ پھر دن بڑے ہی نہیں ہوئے بلکہ وہ سنہری سے زرد اور سیاہ رنگ میں تبدیل ہو گئے۔۔۔ آنکھیں کھلیں تو ایوب کا مارشل لاء لگا دیکھا۔۔۔ یہ اسکول کے دن تھے۔ گھڑ سوار پولیس۔۔۔ کالا باغ ۔۔۔ شاہی قلعہ۔۔۔ یہ پتا نہیں تھا ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی ہے۔۔۔ پھر ایک نیا دور سامنے آیا۔۔۔ یہ ایک ہولناک قسم کی بربریت کا دور تھا۔ نہتے احتجاج

کرنے والوں پر گولیاں ،سیاسی قیدیوں کو جیلیں بھی ہوئی ،سرعام کوڑے
،پھانسیاں ،مذہبی منافرت کی تبلیغ۔۔۔یہ ایک اور مارشل لاء تھا۔۔ نتیجہ
"عذاب شہر پناہ"۔"(۱۷)

انور زاہدی کے افسانوں میں ادب کا سیاسی تناظر اپنی تمام تر سفاکیوں اور کرب کے ساتھ اپنا وجود برقرار رکھتا ہے ۔یہ سیاسی تناظر ایک عام آدمی پر جو اثرات مرتب کرتا ہے۔یہی اثرات آپ کے افسانوں کا موضوع بنتے نظر آتے ہیں۔"عذاب شہر پناہ"،"سرنگ"،"سرد ہوا"،"موسم جنگ کا، کہانی محبت کی" کھلا مین ہول"،"جنگل کٹنے والا ہے"،"ریل کہانی"اور"وبا"آج کے اسی سیاسی تناظر کے حوالے سے اہم فسانے ہیں جس میں مصنف کی سیاسی بصیرت کی عکاسی ہوتی ہے۔

iii۔تاریخ:۔

ماضی کے مختلف واقعات کو جانچنا اور ان کی روشنی میں حال کا مطالعہ کرنا،انسانی ذہن کو بدلنے اور سماج میں تبدیلی کے عمل کو تیز کرتا ہے۔تاریخ ہی وہ وسیلہ ہے جس کی بدولت قومیں اپنے عروج وزوال کی وجوہات پر غور کرتی ہیں اور اپنے زوال کے اسباب کا تدارک کر کے کامیابیوں کے زینے چڑھتی ہیں۔یہی تاریخ مختلف تہذیبوں کے عروج وزوال کا احوال ہوتی ہے۔حکمران طبقہ ہمیشہ تاریخ سے خائف رہا ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

"حکمران ،سیاستدان اور اہل اقتدار تاریخ سے ڈرتے ہیں کیونکہ یہ ان کی طاقت
اثر ورسوخ اور جبر سے آزاد ہو کر ان کے چہروں سے نقاب اتار کر، ان کی اصلی
شکلیں لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔"(۱۸)

تاریخ کا اصل مقصد حقائق کو سامنے لانا، نہ کے درباری مورخوں کے ذریعے صاحب اقتدار طبقے کے عیوب اور جرائم کو چھپا کر ان کی مدح سرائی کرنا ہے۔ادب کی تخلیق میں تاریخی تناظر کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔کیونکہ تاریخی شعور کی بدولت ادیب ان پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے، جو معاشرے میں منفی رجحانات کے فروغ کا باعث بنتے ہیں۔ایک مؤرخ جب بھی تاریخ مرتب کرتا ہے تو وہ اپنے زمانے کے حالات کا اثر ضرور قبول کرتا ہے۔اس کے عہد کے معاشی، سیاسی، معاشرتی اور سماجی حالات کا وہ چشم دید گواہ ہوتا ہے۔حال کو سامنے رکھتے ہوئے ماضی کے اہم واقعات وسانحات کا تجزیہ کرتا ہے۔پاکستان کی سیاسی تاریخ یہاں کے حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔جمہوری اداروں کا زوال،اقتدار کی جنگ اور بدامنی، پاکستان کی تقسیم اور

مختلف سیاسی جماعتوں کا کردار، سب سیاسی زوال کی داستانیں ہیں۔ جن کو کسی نہ کسی انداز میں ادب کا حصہ بنایا گیا۔اردو افسانے نے بھی اسی تاریخی تناظر کو قبول کیا، مختلف افسانہ نگاروں نے اس تاریخی تناظر کو اپنے افسانوں کا حصہ بنایا۔

انور زاہدی کے ہاں یہ تاریخی تناظر بڑا فعال ہے۔اپنے حال کا، اپنے ماضی سے تقابل، آپ کے افسانوں میں جابجا نظر آتا ہے۔آپ عصر حاضر کے حالات کے تحت تاریخ میں کبھی سنہرے اور دلکش ادوار کو کھوجتے ہیں تو کبھی تاریخ کے تاریک ادوار، تہذیبی زوال آپ کا موضوع بنتا ہے۔ماضی کا سنہرا دور ہمیشہ پس منظر میں رہتے ہوئے، اپنے عہد کی محرومی اور مایوسی سے متصادم دکھائی دیتا ہے۔اپنی تاریخ کے ان روشن ابواب کا ذکر کرتے ہوئے، امید نو کی جستجو میں آپ ترقی کے سلسلے کو ہمیشہ اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> ''انور زاہدی کی کہانیاں اپنے عہد کا ایک تجریدی اور علامتی اظہار ہیں۔ تیسری دنیا کا فرد جس طرح خارجی اور داخلی سطح پر شکست وریخت کے عمل سے گزر رہا ہے، انور زاہدی نے اسے نہ صرف خود محسوس کیا ہے، بلکہ اپنی کہانیوں کے ذریعے اسے ایک وسیع کینوس پر پھیلا دیا ہے۔یوں یہ کہانیاں ہمارے عہد کی تاریخ بھی ہیں اور درد آشوب سے نبرد آزما ہونے کے لئے ایک حوصلہ بھی فراہم کرتی ہیں کہ انور زاہدی صرف اس درد غم کے عکاس ہی نہیں اس صورت حال میں جینے کا ایک راستہ بھی دکھاتے ہیں۔''(۱۹)

اپنی تاریخ سے وابستگی، مصنف کے تاریخی شعور اور اپنی ماضی سے محبت کا اظہار ہے۔ قدیم تاریخی واقعات جن کا انسانی زندگیوں سے آج بھی گہرا ناتا ہے۔ماضی کے ان تہذیبوں کے عروج وزوال کی داستانیں جو کبھی اپنی مثال آپ تھیں، مصنف ان تہذیبوں کے زوال سے آج کے تہذیبی زوال میں مماثلت تلاش کرتے ہیں۔ان تاریخی واقعات کے ذکر سے وہ عصر حاضر کے فرد کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ انفرادی سوچ یکجا ہو کر اجتماعی سوچ بنتی ہے اور اس مثبت اجتماعی سوچ کی بدولت قوم اور تہذیب اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ مصنف کا افسانہ ''کھلا مین ہول'' اسی تہذیبی انہدام کی طرف اشارہ کرتا ہے، ماضی خود کو دہرانے کے درپے ہے:

> '' چنگیز کی فوجیں، سمرقند بخارا کی تہذیب کو نیست ونابود کر چکی تھیں، علماء کو تہہ تیغ کیا جا چکا تھا۔کتب خانے جل رہے تھے۔۔۔ایک آگ تھی جو ہر طرف پھیلی

ہوئی تھی اور شعلوں کے اژدہے ہر چیز کو نگل رہے تھے۔بم گر رہے تھے ۔۔۔آسمان بمبار جہازوں کے بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔ ہیروشیما اڑ گیا تھا، ناگاساکی اڑ رہا تھا۔۔۔آسمان سے خون میں ڈوبی ہوئی فاختائیں گر رہی تھیں۔زمین چیچک رو ہو چکی تھی۔انسان، پھر انسان کا دشمن ہوا جاتا تھا۔ معصومیت بیچ چوراہے پر ہراساں نظروں سے خون آشام ڈرامے کو دیکھ رہی تھی۔۔۔بھاری بوٹوں والے پھر زمین کا سینہ کچل رہے تھے۔۔۔دروازے ٹوٹ رہے تھے۔دیواریں گر رہی تھیں۔ عصمتیں لٹ رہی تھیں۔ممتا کے سامنے بیٹیاں، شوہروں کے سامنے بیویاں اور بھائیوں کے سامنے بہنیں بے لباس تھیں۔ چھرے ، کرپانیں ، کلہاڑیاں، گردنیں، سر، ٹانگیں، چھاتیاں دھڑا دھڑ کٹ کر گر رہی تھیں۔ زمین ایک بہت بڑا سلاٹر ہاؤس بن چکی تھی، گوشت کٹ رہا تھا۔۔۔ گوشت جل رہا تھا ۔۔۔ گوشت سڑ رہا تھا۔۔۔ انسانیت پاگل ہو چکی تھی ۔تہذیب کا جنازہ نکل گیا تھا۔۔۔زمین کے کینوس پر ہر طرف وحشت کا راج تھا۔"(۲۰)

بیک وقت مصنف تاریخ کے تین المناک ادوار کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہوئے عصری تناظر کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ مسخ ہو چکی یہ تہذیب بھی آپ کے سامنے ہے۔ بغداد کی تباہی کا منظر، چنگیز خان کے مظالم، جاپان کے شہروں پر ایٹمی حملہ اور امریکہ کے مظالم، پھر قیام پاکستان بعد ازاں سقوط ڈھاکہ سفاکیت اور آمریت کے تاریخی حوالے ہیں، جن میں کرب اور تہذیبی زوال چیخ چیخ کر سنبھلنے کا درس دے رہا ہے۔

تاریخی تناظر کے حوالے سے آپ کی تحریروں میں شہر ملتان کا ذکر کئی جگہوں پر ملتا ہے۔تاریخی حوالے سے ملتان شہر کافی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کے افسانے "ٹوٹا ہوا ٹرک" میں ملتان شہر کا احوال کچھ اس انداز میں ملتا ہے:

"کہتے ہیں تاریخ کے مختلف ادوار میں اس شہر نے بڑی بڑی جنگیں اور ہولناکیاں دیکھی تھیں۔تب اس قدر خون بہا تھا کہ کہیں خونی برج قائم ہوا۔ کہیں آج بھی شہیدوں کی یاد میں بنا ہوا چوک تاریخ کی بربریت کا نشان ہے۔اس مٹی میں شہیدوں کا لہو بھی شامل ہے، جو حملہ آوروں کی تلواروں

کے سامنے سینہ سپر ہوئے شاید اسی عہد ناپرساں میں کسی نے شہر کی تعریف
کرتے ہوئے کہا ہوگا۔ گرد۔۔۔ گرما۔۔۔ گداو گورستان۔"(۲۱)

تاریخی حوالے سے "رین بسیرا"، "طائر شب"، "بائسکوپ دن"، "خبر تحیر عشق سن"، "بے انجام کہانی" اہم افسانے ہیں۔

د۔ ثقافت:

ہر قوم اپنی منفرد تہذیبی شخصیت کی بناپر پہچانی جاتی ہے۔ جس طرح ہر تہذیب کے مختلف طبعی حالات، مختلف سماجی اقدار اور فکر و احساس کا اپنا ایک الگ نظام ہوتا ہے۔ اس نظام کی بدولت وہ تہذیب دیگر تہذیبوں سے ممتاز نظر آتی ہے۔ سبط حسن تہذیب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرز زندگی اور طرز فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنون لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، قواعد، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔"(۲۲)

تہذیب کا وجود انسان کی بنا ناممکن ہے۔ انسان کا براہ راست تعلق تہذیب سے ہے۔ بنیادی طور پر تہذیب انسان کے اس سفر کا نام ہے جس میں انسان موجود سے ناممکنات کی طرف سفر کرتا ہے۔ یہ خصوصیت صرف انسان میں موجود ہے کہ وہ تربیت سے اپنی ذات میں ایسی خصوصیات پیدا کر لیتا ہے، جو دیگر حیوانات نہیں پیدا کر سکتے۔ یہی خصوصیات، عادات واطوار کے منظم ہونے سے تہذیب کے قیام میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ شعور کی دولت سے انسان مختلف تعلقات، رابطوں اور رشتوں سے جڑتا ہے۔ فکر و احساس معاشرے کے افراد کو باہم جوڑنے اور یک جا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ یہی سماجی شعور، سماجی حالات کی بدولت پروان چڑھتا ہے۔ تہذیب کی بنیاد اور اس کا عروج ہمیشہ باشعور، اہل زبان اور اہل علم طبقات کی بدولت ہی ممکن ہوا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

"یہ بات بھی واضح ہے کہ ہر معاشرے میں تہذیب اور کلچر کا سچا نمائندہ ہمیشہ تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہمارے ہاں معاملہ بالکل

برعکس ہے ۔انپڑھ طبقہ ہماری تہذیب کا نمائندہ ہے۔ اس طبقے کا اپنی روایات، عقائد اور اقدار سے اب بھی پورا تعلق باقی ہے۔وہ ان سے نفرت نہیں کرتا۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ، اپنی اقدار، اپنی تاریخ اور اپنی روایات سے نفرت کر رہا ہے۔"(۲۳)

عصر حاضر میں آج کے انسان نے جغرافیائی حدود کو سامنے رکھتے ہوئے نفرت، بغض اور انتقام کی آگ میں اپنے ہزار سال پر محیط ثقافت کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔اس معاشرے کے پڑھے لکھے افراد اس ثقافتی ورثے اور اپنے ماضی سے نالاں نظر آتے ہیں۔ یہ نئی نسل اپنے ماضی اور عظیم تہذیبی و ثقافتی اقدار کو بھول چکی ہے۔ جس سے ایک خلا پیدا ہوا ہے جو کہ مختلف سماجی معاشرتی برائیوں کی وجہ بنا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اسی تہذیبی انہدام کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہمارے معاشرے کا اگر کوئی بنیادی مسئلہ ہے تو یہی تہذیبی مسئلہ ہے ۔ ہماری زندگی میں جو بیزاری پسپائیت، اور کھوکھلا پن نظر آتا ہے۔ ہر قدر، ہر قانون اور انصاف اندھے کی لاٹھی بن گئے ہیں۔اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ یہ تضاد، عدم تحفظ کا احساس، پسپائیت اس بات کی علامت ہے کہ ہماری مروجہ اقدار آتش شوق بھڑکانے کی قوت نہیں رکھتیں۔"(۲۴)

مصنف کی تحریروں میں ثقافتی حوالے فنون لطیفہ، یعنی آرٹ کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ان میں طرز تعمیر، ادبی ماحول، موسیقی وغیرہ شامل ہیں۔اس کے علاوہ اخلاقیات، انسانی رویے، طرز معاشرت بھی تہذیبی ورثے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ معاشرہ ہی حقیقت میں کلچر کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔ معاشرے میں موجود مختلف طبقات، اور ان کے رویے ہی کلچر کی صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک پاکستانی تہذیب مختلف ثقافتوں کے ملاپ سے وجود میں آئی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

"پاکستانی تہذیب، اپنی علاقائی تہذیبوں اجتماعی سوچ، نظریہ حیات اور اجتماعی خوابوں سے مل کر بنی ہے۔ پاکستانی ثقافت کی یہ صورت جو مجموعی فضا بناتی ہے، وہ پاکستانی ہے۔"(۲۵)

عصر حاضر میں ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں اس میں منفی سوچ، منفی رویے اور منفی روایات کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ عام انسان کی زندگی عدم تحفظ اور بے سکونی کا شکار ہے۔ بے انصافی کا دور دورہ ہے۔ مثبت اقدار زوال پذیر ہیں۔ یہ تمام عناصر معاشرتی بگاڑ کا باعث بن رہے ہیں۔ اپنی تہذیبی و ثقافت سے جڑے رہنے میں ہی ہماری بقا ہے۔ اس گھٹن زدہ فضا میں انسانیت کا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ یہی گھٹن آپ کے افسانوں کا اہم موضوع ہے۔ اس بارے میں منشا یاد لکھتے ہیں:

> ''انور زاہدی کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے ہم جس ماحول اور معاشرے کی تصویریں دیکھتے ہیں ،وہ ہم سب کا جانا پہچانا ہے ۔اس میں ایک جیسے موسم ہیں، جو تبدیل نہیں ہوتے اور خلق خدا موسموں کی اس یکسانیت سے بلبلا اٹھتی ہے ۔موسم اور صورتحال ایک طویل عرصے تک تبدیل نہ ہو تو انسان پتھر بن جاتے ہیں۔''(۲۶)

و۔ یاد ماضی :

یاد ماضی سے مراد ہے، ماضی کی یاداشتیں اور ان واقعات کا بیان، جن کا تعلق ماضی قریب یا ماضی بعید سے ہو۔ ڈاکٹر محمد اشرف کمال اس کے لئے ناسٹلجیا کی اصطلاح پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ماضی کی باتوں کو یاد کرنا،ماضی میں زندہ رہنا۔ ماضی کو حال سے بہتر سمجھنا "ناسٹلجیا" کہلاتا ہے۔ پچھلی باتوں، گزرے دور کو شعور کا حصہ بنانے اور بکھرے سانچوں کو منظم کرنے کی حسرت ناسٹلجیا ہے۔''(۲۷)

نئی صدی کے ان بیس برسوں میں تہذیبی ،معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورتحال میں اس قدر تبدیلیوں کا ایسا دور گزرا ہے ،جس میں مسائل و مصائب اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ یہی کیفیت انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ معاشرے کا فرد شدید ذہنی اذیت اور فرسٹریشن کا شکار نظر آتا ہے۔ یہ اثرات ادب کی ہر صنف نے قبول کیے۔

فرد کو مستقبل میں کامیابی اور امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ حقیقتیں اب اس قدر بھیانک روپ دھار چکی ہیں کہ ان کا سامنا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ایسے حالات میں ماضی سے رشتہ جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ عصر حاضر کی نئی نسل اپنے ماضی سے فرار چاہتی ہے، نئی تہذیبی و ثقافتی یلغار نے انسان کو ترقی کی آڑ میں

ایسے کرب کی دلدل میں دھکیل دیا ہے جس سے نکلنا، سماجی اور فکری رجحانات میں بڑی تبدیلی ہی کی بدولت ممکن ہے۔ مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

> ''بیتا ہوا ماضی ہمیں مفاہمت سکھاتا ہے۔ فرار اختیار کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ کھرا ماضی وہ زندہ روایت ہے، جس سے اپنے تعلقات کی تشہیر ہم نہیں کرتے ۔ تبدیل شدہ تہذیبی صورت حال میں اپنا ڈرائنگ روم ہم روایتی فرنیچر سے نہیں سجاتے۔''(۲۸)

انور زاہدی اپنے شاندار ماضی کے ذکر سے اس موجودہ صورت حال میں جینے کی امید اور حوصلہ پاتے ہیں۔ آپ کے آخری دو مجموعے "مندر والی گلی" اور " بائسکوپ دن" سب ماضی کے حوالے ہیں۔ نئے عہد کی جستجو، وہ تحرک ہے جو ماضی کی محبتوں اور ان تہذیبی اقدار کے اظہار کے لئے مصنف کو ہمہ وقت مضطرب کیے رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اے بی اشرف اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ان کی تمام کہانیوں میں خود اپنے حوالے، ترک کیے ہوئے شہروں کے حوالے، اپنے عزیزوں کے، دوستوں کے حوالے، گلی کوچوں کے حوالے بڑے تواتر کے ساتھ آتے ہیں۔ واقعات اور شخصیات کو بیان کرتے ہوئے رومانوی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کہانیوں میں اسراریت کا عنصر خود بخود نمایاں ہو جاتا ہے۔''(۲۹)

حوالہ جات

۱۔انور زاہدی،ڈاکٹر،سید مقصود زاہدی شخصیت اور فن،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۱۰ء،ص۔۲۵

۲۔ شفیق انجم،ڈاکٹر،انور زاہدی کی کہانیاں، فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۹ء،ص۔۸

۳۔ ممتاز مفتی،اوکھے اولڑے،فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ،راولپنڈی،۱۹۹۵ء،ص۔۸۰

۴۔۔وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتب خانہ،لاہور،۲۰۰۳ء،ص۔۹۱۸

۵۔ Qaumi English Urdu Dictionary,www.nlbp,gov.pk

۶۔ http.//ur,m wiki pedia.org/wiki

۷۔ایم وائی خان، ہمارے سماجی رویے، کرن ریسرچ اینڈ ایجوکیشن فاونڈیشن،واہ کینٹ،۲۰۰۳ء،ص۔۸

۸۔صباءاکرام، نیاافسانہ چند صورتیں، مشمولہ اردو افسانے میں جدیدیت،زین پبلی کیشنز، کراچی،۲۰۰۱ء،ص۔۱۴

۹۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۲۰۸

۱۰۔انور زاہدی،ڈاکٹر، مندر والی گلی،دوست پبلی کیشنز،۲۰۰۷ءص۔۹۷

۱۱۔انور زاہدی،ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۔۲۷

۱۲۔مبارک علی،ڈاکٹر،تاریخ کے نئے زاویے،تاریخ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ءص۔۱۵۶

۱۳۔صباءاکرام،اردو افسانہ چند صورتیں،زین پبلی کیشنز، کراچی،۲۰۰۱ءص۔۶۷

۱۴۔طاہرہ اقبال،ڈاکٹر، پاکستانی اردو افسانہ سیاسی و تاریخی تناظر میں، فکشن ہاوس،لاہور،۲۰ص۔۲۱۷

۱۵۔رشید امجد،ڈاکٹر،مزاحمتی ادب،اکادمی ادبیات، پاکستان،۲۰۰۹ءص۔۲۱

۱۶۔رشید امجد،ڈاکٹر، پاکستانی اردو ادب، ص۔۲۷

۱۷۔انور زاہدی،ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۔۸

۱۸۔مبارک علی،ڈاکٹر،تاریخ کے نئے زاویے،تاریخ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ءص۔۱۱

۱۹۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،فلیپ،ڈاکٹر رشید امجد،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۳

۲۰۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۱۰۷،۱۰۶

۲۱۔ شفیق انجم،ڈاکٹر،انور زاہدی کی کہانیاں، فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۹ء،ص۔۱۲۴

۲۲۔سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء،آٹھواں ایڈیشن، مکتبہ دانیال، کراچی،۱۹۸۹ء،ص۔۱۳

۲۳۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، باراول، مشتاق بک ڈپو،۱۹۶۴ء،ص۔۲۳

۲۴۔ایضاً۔ص۔۳۲

۲۵۔رشید امجد،ڈاکٹر، پاکستانی ادب: رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص۔۱۶
۲۶۔انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ، فلیپ، منشایاد، ابلاغ، اسلام آباد، ص۔۱۳
۲۷۔محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور ادبی اصطلاحات، بی پی ایچ پرنٹرز لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۔۱۶۶
۲۸۔مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، افسانے کا منظر نامہ، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء ص۔۱۴۶
۲۹۔انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فلیپ ڈاکٹر اے بی اشرف، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء ص۔۱۳

باب دوم: انور زاہدی کے افسانوں کی فکری جہات:۔

ا۔انور زاہدی کے افسانوں کا زمانی تعین:

ادیب اپنے معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے۔ معاشرے سے وابستہ عوام و خواص کی ترجمانی ہی ادیب کو صحیح معنوں میں ادیب بناتی ہے۔ مصنف جب عام آدمی کی آواز بنتا ہے تو دقیق فکر، تجزیے اور احساسات و جذبات کو الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے، وہ اس سارے معاشرے اور عہد کا بھی ترجمان ہوتا ہے۔ایک مکمل عہد کا عکس مصنف کی تحریروں سے عیاں ہوتا ہے۔ کسی بھی دور کے حالات و واقعات،افراد کے مسائل، سماجی سرگرمیوں، رسوم و روایات سے آشنائی، ہمیشہ ادب کے مطالعے سے ہی ممکن ہو پائی ہے۔ کسی بھی مصنف کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد، ان کا تجزیہ تب ہی ممکن ہے جب تک اس مصنف کے عہد اور زمانے کے بارے میں ادراک اور مکمل آگاہی حاصل نہ ہو۔ زمانی تناظر ادب کی بنیاد تب ہی بنایا جاسکتا ہے، جب ادب کے ذریعے عصری صورتحال کا اندازہ کرنا مقصود ہو۔ زمانی تناظر میں یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ مصنف اپنے عہد کی انسانی و تہذیبی صورتحال کو کس حد تک بیان میں لاسکا ہے اور مصنف نے سچ کو کتنا سہارا دیا ہے۔ کسی بھی دور میں تخلیق ہونے والے ادب بلخصوص افسانوں کے زمانی تناظر کی بات کی جائے تو ہمیں اس عہد میں انسانی زندگی کے معیار، انسان کی ذہنی کیفیات، اور اس کے دل و دماغ پر ان حالات کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ زمانی تعین کے مطالعہ کی اہمیت کے بارے میں مبین مرزا اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''اس مطالعے سے حاصل ہونے والے نتائج میں اپنے عہد کی انسانی صورتحال کو عقلی، جذباتی اور روحانی سطح پر دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔''(۱)

عصر حاضر کی ان آخری چار دہائیوں میں عالمی منظر نامے نے ایک الگ شکل اختیار کر لی ہے۔اس نئی صورتحال کے پس منظر میں بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے، جنہوں نے سوچ کے دھاروں کو یکسر بدل دیا۔ ان حالات نے عام آدمی کی زندگی کو بہت متاثر کیا۔ انسانی تاریخ میں بیسویں اور اکیسویں صدی کی یہ کیفیت اپنا ایک الگ رنگ، نئی سوچ اور فکر کے نئے زاریوں کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ یہ کیفیت اور رجحان، انسانی فکر کے حوالے سے نئے فکری زاویے اور بدلتی صورتحال کو جنم دے رہی ہے، جو کہ دنیائے ادب میں نئے رجحانات اور فکر کے نئے در وا کر رہی ہے۔ انسانی خواہشات اور خوابوں نے جس طرح انسانیت کو تار تار کیا، اس کا آغاز موجودہ

صورتحال میں دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی، پر ظلم و بربریت سے ہوتا ہے۔اب بات پہنچتے پہنچتے نیو ورلڈ آرڈر تک آ پہنچتی ہے، جو کہ بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں نمایاں طور پر سامنے آئی ہے۔

عالمی سطح پر دیکھا جائے تو ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی، دہشت گردی کا آلاپ ،افغانستان امریکہ تعلقات میں کشیدگی، جنگ و جدل، لیبیا، مصر اور شام کی حکومتوں میں تبدیلیاں، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف جیسے اداروں کا معاشی نظام، یہ سب وحشت و بربریت، سفاکیت، فرد کی بے توقیری، ظلم و جبر، بے یقینی، ڈر اور خوف کی فضا کو جنم دیتے ہیں۔اہل مغرب اور خاص طور پر امریکہ نے اپنی خواہشات اور اقتدار کی دوڑ میں ظلم کا بازار خوب گرم کیا۔اسی تناظر میں ڈاکٹر نجیبہ عارف رقمطراز ہیں:

> ''بیسویں صدی کے آخری عشروں پر محیط سرد جنگ کے دوران مغربی کیپٹلزم کو غیر معمولی برتری حاصل تھی۔چنانچہ نتائج بھی اس کے حق میں ہی نکلے۔ سائنس، ٹیکنالوجی، معلوماتی وسائل اور ارتکاز دولت کے ذرائع پر بلا شرکت غیرے امریکن گرفت کو اسی دور میں غیر معمولی وسعت، استحکام اور فوقیت حاصل ہوئی، جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔''(۲)

اس عالمی منظر نامے نے پاکستان کے حالات و واقعات پر براہ راست اثرات مرتب کیے۔پاکستان کے سیاسی معاشی، سماجی، مذہبی غرض ہر مکتبہ فکر اور شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کرنے میں عالمی منظر نامے اور بدلتی صورتحال کا ہی اثر ہے۔اس صورتحال نے اردو ادب کو کافی متاثر کیا۔اس سارے منظر نامے میں پاکستان کی مخصوص سیاسی و دفاعی حیثیت، جغرافیائی اعتبار سے پاکستان کا وجود، پاکستان کے سیاسی حالات، معاشرتی زندگی، امن اور آسودگی پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔

ان اثرات کو ادباء نے بھی قبول کیا۔ ہر صنف ادب میں نئے رجحانات فکر کی نئی جہات، نئے نئے موضوعات اردو ادب کا حصہ بنے۔افسانہ نگاری میں افسانہ نگاروں نے عالمی و پاکستانی صورتحال کے تناظر میں عام آدمی کے احساسات و جذبات کی ترجمانی احسن انداز میں کی۔اس حوالے سے ڈاکٹر انور زاہدی بطور افسانہ نگار اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان کی دقیق فکر، وسیع مطالعہ اور عالمی منظر نامے پر گہری نظر ان کے افسانوں میں جھلکتی نظر آتی ہے۔عالمی و ملکی صورتحال نے جس طرح ہمارے اس سماج کو متاثر کیا، عام آدمی کی فکر بھی ان

سے متاثر ہوئی۔ انور زاہدی نے اپنے افسانوں میں ان موضوعات کو قلمبند کیااور عام آدمی کے احساسات و جذبات اوراسے درپیش مسائل کااحاطہ کیا۔

انور زاہدی کی افسانہ نگاری کا زمانی تعین کیا جائے تو عالمی سطح پر نیو ورلڈ آرڈر،ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ ،امریکہ عراق جنگ، دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں مسلم ممالک پر دباؤاور پابندیاں، نائن الیون کا المناک واقعہ، افغانستان میں خانہ جنگی، مشرق و مغرب کا تصادم، وغیرہ، بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائیوں پر مشتمل ہے۔ان عالمی حالات وواقعات کااثر پاکستان پر بھی پڑا۔اس حوالے سے پاکستان کی سیاسی صورت حال ،پے در پے مارشل لاء کے ادوار، سانحہ مشرقی پاکستان، پاکستان اور بھارت کے مابین دوخون ریز جنگیں،ذوالفقار علی بھٹو کادور حکومت اور پھانسی، پاکستان کے ایٹمی دھماکے، پاکستان کی دہشت گردی کے خلاف جنگ ،ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا عظیم سانحہ ،۲۰۰۵ء کا المناک زلزلہ، سانحہ اوجڑی کیمپ، ارضی وسماوی آفات الغرض ان سب واقعات نے اردو افسانے میں کہیں نہ کہیں اپنا ذکر ضرور چھوڑااور ادباء کی قلم کی زد میں رہے۔اس حوالے سے انور زاہدی کا نام سامنے آتا ہے، جنہوں نے ان موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔

انور زاہدی کے افسانوں کے زمانی تعین کے حوالے سے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''انورزاہدی کے افسانے تیسری دنیا کے اعصاب شکن ماحول خصوصاً سوشیو پولیٹیکل اور نفسی الجھاووں کے ایسے ان چھوئے منطقوں کو پیش کرتے ہیں ،جو بہت اجنبی اور انوکھے نہ سہی، لیکن ذرا مختلف جہات سے محسوس کیے گئے علاقے ہیں۔انور زاہدی پوسٹ وار پیریڈ یا شاید پری وار پیریڈ کی اوڈیسی لکھنے میں مگن ہے۔''(۳)

انور زاہدی کے افسانوں میں جبریت، داخلی اور خارجی سطح پر موضوع کے طور پر سامنے آتی ہے۔یہ موضوع کچھ تو وجودیت کی وجہ سے عام ہوا، کچھ پاکستان میں مسلسل سیاسی انتشار اور آمریت کے ادوار میں مختلف پابندیوں کی بدولت جدید افسانے میں زیر بحث رہا۔اس بارے میں ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

> ''جبر کا موضوع اردو افسانے میں کچھ تو وجودیت کے زیر اثر اور کچھ مارشل لاء کی پابندیوں کی وجہ سے اختیار کیا گیا۔ پاکستان میں پے در پے مارشل لاء کے نفاذ نے

بھی کچھ اسی طرح کی فکر پیدا کی اور جبریت کے عناصر اردو افسانے کا حصہ بنتے چلے گئے۔"(۴)

مارشل لاء کے دور کی جبریت، اظہار رائے پر پابندی، آمریت، خوف و ہراس، بے یقینی و عدم تحفظ یہ تمام موضوعات انور زاہدی کے افسانوں کا حصہ ہیں۔ خصوصی طور پر ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "عذاب شہر پناہ" میں کئی افسانے، جیسے "عذاب شہر پناہ"، "بے چہرہ کہانی"، "دوسرے سیزر کی موت"، "کھلا مین ہول"، "شہر بدر ہمزاد"، "سرنگ" ایسی بہت سی کہانیاں ہیں، جو کہ عصری انتشار پر نوحہ کناں ہیں۔ اس صورت حال کو انور زاہدی اپنے افسانے "کھلا مین ہول" میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ہم کھلے مین ہول میں سے آسمان کو تک رہے تھے، اور ہمارا ہر سانس اٹھتے ہوئے تعفن کی بھینٹ ہو چکا تھا۔ باہر لوگوں کا ہجوم سورج کو اپنے سروں پر بٹھائے، شہر کی عظیم الشان عمارت کی جانب رواں دواں تھا۔ ان کے چاروں طرف بھاری بوٹوں کی گرج تھی اور آسمان گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا۔"(۵)

انوار زاہدی نے اپنے افسانوی مجموعے "مندر والی گلی" میں نائن الیون کے بعد کی صورتحال کو بھی بیان کیا ہے۔ "یہ جنگل کٹنے والا ہے" افسانے میں عراق امریکہ جنگ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس افسانے میں انور زاہدی ایک مریض کا احوال بیان کرتے ہیں، جو اپنے خواب کا ذکر اپنے معالج سے کرتا ہے۔ جس میں ماضی کے واقعات، خوابوں کی صورت میں افسانے کے مرکزی کردار کے ذریعے سامنے آتے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ بے چین رہتا ہے۔ بظاہر یہ معالج اور مریض کے مابین مکالمہ نظر آتا ہے، مگر انور زاہدی نے کمال مہارت سے اس نئے منظر نامے کی عکاسی کی ہے۔ خوابوں کے وسیلے سے عصر حاضر کی صورتحال، اقتدار کی ہوس اور نیو ورلڈ آرڈر کی بدلتی صورتحال کو قلمبند کیا ہے۔

انور زاہدی ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مذکورہ بالا افسانے میں انور زاہدی ایک ایسے شہر کی بربادی پر نوحہ کناں ہیں، جو کہ اپنے شاندار ماضی کے ساتھ نیست و نابود ہو گیا:

"یہ ہلاکو خان کا فتح شدہ بغداد ہے، بیس لاکھ آبادی کا۔۔۔ بھرا پرا۔۔۔ بسا بسایا خلیفہ المستعصم کا برباد بغداد جو اپنی اسی فیصد آبادی سے محروم ہو چکا تھا۔۔۔ ایک ایسا تہذیب یافتہ شہر جس کے کتب خانے جل جانے کے بعد اب سلگ رہے تھے۔ ایک آگ تھی جو سارے شہر کو چاٹے جا رہی تھی، مساجد کے مینار و گنبد

زمین بوس تھے۔ بغداد کی گلیوں میں اس قدر خون بہتا تھا کہ اس میں گھوڑوں
کے سم ڈوبتے تھے۔۔۔ وہ شہر جو شہر زاد اور الف لیلہ کا شہر تھا۔"(۶)

"یہ جنگل کٹنے والا ہے" میں مصنف بابل و نینوا کی تہذیب کا ذکر اس خوبصورت انداز میں کرتے ہیں کہ قاری خود کو اس تہذیب کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ ماضی اور حال کا تقابل اس افسانے کا خاصہ ہے۔ لیکن بعد ازاں اس خطہ ارض کے ساتھ کیا ہوا، دنیا اس بات کی گواہ ہے۔ اس سارے واقعے کو انور زاہدی "ٹاور آف بیبیلون" سے جوڑتے ہیں، کہ کیسے یہ بلند و بالا ٹاور اپنی منازل کے ہمراہ ترقی کی منازل طے کرتا ہے پھر کیسے اچانک منہدم ہو جاتا ہے۔ ہماری تہذیب کے فنا ہو جانے اور انسانیت کے تار تار ہو جانے پر انور زاہدی نوحہ کناں ہیں۔ اسکا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اچانک وہ بلند و بالا ٹاور اور جسے ای میل میں ٹاور آف بیبیلون کے نام سے
موسوم کیا گیا تھا۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے منہدم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔۔۔ آنکھوں
کے سامنے ٹاور آف بیبیلون بیٹھ جاتا ہے۔ جیسے انسانی ہاتھوں میں تعمیر کردہ حسن
بے مثال کی بجائے وہ محض ایک ہاوس آف کارڈز ہو۔ پھر میری آنکھوں کے
سامنے بس مٹی کا اک ڈھیر رہ جاتا ہے۔"(۷)

اس افسانے میں مصنف نئے عالمی منظر نامہ کا خاکہ اس انداز میں کھینچتے ہیں کہ کیسے مغربی طاقتیں، ہلاکو خان کے عہد کو دہرانا چاہتی ہیں، پھر عراق، مشرق وسطیٰ میں خون کا بازار گرم کرنا چاہتی ہیں۔ صیہونی طاقتیں اس زمین کو آگ کا سمندر بنانے کے درپے ہیں۔ ایٹمی ہتھیاروں، نت نئے میزائلوں اور طیاروں کی آگ اگلتی گنیں، سب بابل و نینوا کی سرزمین میں خون کی ہولی کھیلنے کو بیتاب نظر آتی ہیں:

"ایک بار پھر۔۔۔ بابل و نینوا کی سرزمین آگ و خون میں نہا رہی تھی۔۔۔ جیسے
ہر عہد اپنے یزید تخلیق کرتا ہے۔۔۔ ویسے ہی ہر زمانے میں ایک کربلا کی
بازیافت ہوتی ہے۔۔۔ سات سو برس پہلے جو کچھ ہلاکو خان نہ کر سکا تھا۔۔۔ اب
نیا دنیاوی حکم اس سے کہیں زیادہ کر دینے کے درپے تھا۔۔۔"(۸)

مصنف کے نزدیک جب فاتح قومیں کسی علاقے پر اپنا تسلط قائم کرتی تھیں، تو ان کے نزدیک تاوان کے پیمانے محض جواہر، سونا چاندی اور مال غنیمت میں لوٹی ہوئی عورتوں کے علاوہ، غنیمت کا مال ہوتا

تھا، جو کہ فاتح اور اس کے اتحادیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ مگر اب کی بار ایک نیاد نیاوی حکم سب کو اپنے ماتحت کرنے کے لیے بے تاب ہے۔اس حکم کی تکمیل کے لیے وہ کسی حد تک جانے کے لیے بے چین نظر آتا ہے۔ آج کا ہلاکو خان اپنے عہد کو نئے انداز میں دہرا رہا ہے۔اس عہد کا ہلاکو خان محض زر و جواہر کا خواہاں نظر نہیں آتا،اب وہ یہ راگ الاپتا نظر آتا ہے کہ دنیا کو کیسے بچایا جائے۔۔۔لیکن اس کے اس جملے میں اس کے ناپاک ارادے عیاں ہیں۔اس کا اصل مقصد مشرق وسطی پر اپنا تسلط جما کر یہاں کی دولت اور معدنی وسائل پر اپنا قبضہ جمانا ہے،اور اپنی توانائی کے ذخائر میں قابل ذکر اضافہ کرنا ہے:

> ''آج کے ہلاکو خان کا ہدف۔۔۔۔ خلیفہ وقت یا سونا چاندی نہیں اور نہ ہی اس کے حرم میں موجود شہزادیوں، کنیزوں، غلاموں اور خدام کو اپنے قبضے میں لینا مقصود نہیں۔۔۔بلکہ بابل و نینوا کی زمین میں چھپا ہوا وہ سیاہ خزانہ، ان کا منتہائے مقصد ہے۔''(۹)

امریکہ کا مشرق وسطیٰ میں موجود تیل کی دولت پر قبضہ، دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توانائی کے ذخائر پر قابو پا کر پوری دنیا پر قبضہ اور اپنی اجارہ داری قائم کی جاسکتی ہے۔اس خام تیل کو حاصل کرنے کا مقصد مغربی محلات کو روشن کرنا نہیں، بلکہ دنیا کو غلام رکھنے کی خاطر وہاں کی شبانہ روز چلنے والی فیکٹریاں جو دن رات اسلحے کے ڈھیر تیار کرتی ہیں۔تاکہ اپنی طاقت میں اضافہ کیا جاسکے۔اس بات کے لئے انہیں بے بہا توانائی کی ضرورت ہے۔ان طاقتوں کا اصل مقصد اسلحے کی افزائش ہے نہ کہ دنیا کو بچانا ہے۔

ب۔انور زاہدی کے افسانوں کا فکری پس منظر:

معاشرے کا سب سے حساس ترین طبقہ ادباء کو سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ معاشرے کے حساس پہلو اور محرومیوں کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرواتے ہیں۔انور زاہدی نے پاکستان کی سیاسی حالات میں ابتری کو اپنا موضوع بنایا۔اس کے علاوہ انہوں نے مسلسل مارشل لاء کے نتیجے میں فرد کو درپیش مسائل کو قلم بند کیا ہے۔ مختلف کرداروں اور اور کہانی کے ذریعے، ماضی اور حال کے مسائل کو افسانوں کا روپ دیا ہے۔

قیام پاکستان کے نتیجے میں ہونے والے فسادات نے عام آدمی کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیااور اس کااثر قیام پاکستان کے بعد تخلیق ہونے والے ادب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ادب کی کوئی بھی صنف،اس عظیم واقعے کے اثرات کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔اردو افسانے نے بھی اس عظیم تبدیلی کے اثرات قبول کیے۔ تقریباً قیام پاکستان کے بعد دو دہائیوں تک یہی موضوع جو مختلف حوالوں سے اردو افسانے کا حصہ بنتا رہا۔ بعدازاں جدیدیت کے فکری رجحان نے بھی اردو افسانے کو متاثر کیا۔ کسی ملک کے سیاسی حالات، براہ راست اس ملک کی عوام پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

زندگی کا ہر شعبہ سیاسی حالات میں تبدیلی کی وجہ سے متاثر ہوتا ہے۔ تہذیبی، معاشرتی، معاشی اور تاریخی سطح پر سیاسی حالات ،معاشرے کے افراد کی زندگی پر گہرا اثر ڈالتے ہیں ۔انور زاہدی نے فرد کی بے توقیری، عدم شناخت ،معاشرے کے فرد کو درپیش مسائل ،بے یقینی و لایعنیت کی کیفیت، معاشرتی ناہمواری، ظلم و بربریت ،بے انصافی اور بے حسی جیسے موضوعات کو اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے اور مختلف موسموں کو استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے پاکستان کے سیاسی حالات کو ضبط تحریر کیا ہے۔

اپنے حال سے مایوس فرد کو اپنے شاندار ماضی کے سہارے زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہوئے انور زاہدی خود یادِ ماضی میں جھانکتے ہیں۔آپ اپنی عظیم تہذیبی و ثقافتی اقدار،ماضی کی یادوں کے سہارے عصر حاضر کے انسان کو جینے کا حوصلہ فراہم کرتے ہیں۔انور زاہدی نے بھی جدیدیت کے اثر کو قبول کیا۔انور زاہدی کے پہلے افسانوی مجموعے "عذاب شہر پناہ" کے بیشتر افسانے علامتی پیرائے میں ملکی صورتحال کو بیان کرتے ہیں اور موجودہ حالات کو عام قاری کے سامنے بیان کرتے ہیں۔انور زاہدی اپنے بے باکانہ انداز تحریر سے عصر حاضر کے فرد کو درپیش مسائل سے آگاہ کرتے ہیں،اور ایک بہترین لکھاری ہونے کا حق ادا کرتے ہیں۔

i۔ جدیدیت کا فکری آہنگ :۔

جس طرح انسان کی زندگی محو سفر ہے،اسی طرح ادب بھی محو سفر ہے۔جن حالات وواقعات اور شب و روز نے انسانی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کئے،اسی طرح اس عہد میں تخلیق ہونے والے ادب پر بھی اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔کسی بھی خطّہء ارض میں تخلیق ہونے والا ادب،وہاں کے باسیوں کے احساسات وجذبات کا ترجمان ہوتا ہے۔اسی کے ساتھ عصر حاضر سے بھی مکمل آگاہی کا پیش خیمہ بنتا ہے۔اسی تناظر میں گوپی چند نارنگ رقم طراز ہیں:

''ادب بھی زندگی کی طرح ایک سفر ہے، عہد بہ عہد، منزل بہ منزل، جس میں
حالات بدلتے ہیں، ترجیحا تبدلتی ہیں ، رویے بدلتے ہیں، لوگ بدلتے ہیں،
تقاضے بدلتے ہیں، فضا بدلتی ہے، مناظر بدلتے ہیں، تبدیلی جس طرح زندگی میں
ناگزیر ہے، ادب میں بھی ناگزیر ہے۔''(۱۰)

اسی طرح اردو افسانے نے بھی کئی منازل طے کیں۔ عصری تقاضوں اور رجحانات کے مطابق یہ صنف ادب ڈھلتی گئی۔ جدیدیت بھی ایک ایسا رجحان ہے، جو ۱۹۶۰۔۱۹۵۵ کے عشرے میں پاکستانی ادب پر اثر انداز ہوا۔ پاکستان کے سیاسی و معاشرتی حالات، عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیاں، نیا منظر نامہ، سب وہ عوامل بنے جو کہ جدیدیت کی شکل میں سامنے آئے۔ جدیدیت کو الگ سے بیان کرنا اس لئے بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ ہر زمانے کا لازمی جزو ہے۔ انسانی تاریخ میں جدت اور اس کے کردار سے انکار ممکن نہیں ہے۔ انسان ہمیشہ تغیر پسند رہا ہے ہمیشہ اپنے حال میں رہتے ہوئے مستقبل کے ان چھوئے منطقوں کی کھوج ہمیشہ انسان کے لیے مرکز و محور رہی ہے۔ جدیدیت کی وضاحت تب تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک کوئی مخصوص زمانہ اور اس کا پس منظر حقیقت کو بیان نہ کرے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

''جدیدیت کے لیے معاصریت یا بغاوت کی اصطلاحیں بھی استعمال کی جاتی رہی
ہیں، انفرادیت اور نئی معنویت بھی اور اجتہاد کی آزادہ روی بھی۔''(۱۱)

تقسیم ہندوستان ایک ایسا واقعہ ہے جو کہ ایک ایسی بڑی ہنگامہ خیزی کا باعث بنا۔ جس کے اثرات عصر حاضر میں اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جہاں اس عظیم واقعے کو سانحے سے تشبیہ دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کی جا سکتی، وہیں اس کی خونریزیوں، ہنگامہ خیزی نے انسانی احساسات و جذبات کو بھی مجروح کیا۔ انسانیت تار تار ہوئی، صدیوں سے پروان چڑھنے والی تہذیب ایسی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی کے داخلی و خارجی انتشار، فرد کی بے توقیری عدم تحفظ، جبریت جیسی اصطلاحات کو منظر عام پر لے آئی۔ فسادات میں انسانی تہذیب و تمدن کو کافی متاثر کیا۔ خوف، بربریت، دہشت، ظلم جیسے رویے بیزاری کو جنم دینے لگے۔ پورا معاشرہ تباہی اور خستہ حالی کا شکار ہوا۔ پاکستان کے سیاسی حالات میں ابتری، معاشی اور سماجی مسائل نے عام آدمی کے مسائل میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ زندگی سے بیزاری اور گھٹن کی فضا نے انسانی زندگی کو ایک ایسی تاریک سرنگ میں دھکیل دیا، جہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر فردوس انور قاضی فرماتے ہیں:

"دلوں کی نفرتیں۔۔۔فساد۔۔۔ ملک کی تقسیم، مذہبی اختلاف، یہ سب تو ایک بہانہ تھا۔فساد کے دوران جو بھی خون خرابہ ہوا ۔۔۔درندگی کے اذیت ناک اور ہیبت ناک جو بھی انداز اختیار کیے گئے، وہ دراصل ذہنوں کے اندر چھپی ہوئی وہ غلاظتیں تھیں، جن کو معاشرتی قوانین نے چھپا رکھا تھا۔"(۱۲)

نوزائیدہ پاکستان میں روزگار کے کم مواقع ہونے کی بدولت غربت اور افلاس نے معاشرے کو طبقات میں تقسیم کر دیا۔ سیاسی انتشار، حکومتی بدانتظامی، سیاسی و مذہبی تعصبات، طبقاتی کشمکش، معاشرتی اقدار کے زوال ،غربت و افلاس نے خوف، عدم شناخت، معاشرتی ناہمواری، لاقانونیت، تنہائی جیسے عناصر کو جنم دیا۔ان تمام عناصر کی موجودگی میں ایک ایسا مفلوج اور گراہوا معاشرہ تخلیق ہوا جو کہ داخلی ناآسودگی، بے اطمینانی، جھلاہٹ جیسی کیفیات سے دوچار تھا۔ایک پرامن اور پرخلوص مسلم معاشرے کا قیام، جو کہ عدل وانصاف کا منبع ہوگا اور ترقی کی منازل طے کرنے کی بجائے تنزلی کا شکار ہو چلا تھا۔

جدیدیت کا فکری رویہ بالکل ان اذہان کی پیداوار تھا جو کہ داخلی ناآسودگی کا شکار ہو چکے تھے۔ معاشرے کا جمود جدیدیت کے زیر اثر آیا اور ایک بغاوت اور انفرادیت کی فضا کو جنم لینا ایک ارتقائی عمل تھا۔ادب کی تخلیق میں حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کی بدولت وہ تمام کوششیں جاری تھیں، جو کہ معیاری ادب کے فروغ کا باعث بنیں۔ نظریاتی جنگ اور معیاری ادب کی تخلیق میں ایک دوجے سے برتری جیسے عوامل نے معیاری ادب تخلیق کیا گیا۔اسی بنا پر ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے عہد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ان حالات میں ادب کی دیگر اصناف کے ساتھ اردو افسانہ نگاری بھی کافی حد تک متاثر ہوئی۔ جدیدیت کا تعلق عصری شعور کے ساتھ، کافی اہمیت کا حامل ہے۔ جدیدیت اور عصری شعور ایک دوجے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ جدیدیت کے رجحان کی بدولت موضوعات میں اضافے کے ساتھ زبان وبیان، نئی نئی ادبی تحاریک کا آغاز، اسلوب اور زبان وبیان میں نت نئے تجربات سامنے آتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد جدیدیت کی تفہیم اس انداز میں کرتے ہیں:

"زیادہ واضح لفظوں میں جدیدیت اپنے عہد کے شعور اور مجموعی ادبی و لسانی ارتقاء کے ساتھ چلنے کا نام ہے۔ چنانچہ ہر دور کے وہ فنکار جن کی تخلیق میں یہ دونوں عناصر موجود ہوں، اپنے عہد میں جدید ہوتے ہیں۔"(۱۳)

اس دور کے مسائل بھی بیان میں لائے، عصری شعور کہلاتا ہے کیونکہ کسی بھی عہد سے تعلق رکھنے والا ادیب عصری شعور کی بدولت اس وقت کے مسائل اور حالات کو قلمبند کر سکتا ہے، جن سے اس کی ذات براہ راست متاثر ہوتی ہے۔اسی فنی رویے کو زبان و بیان، اسلوب کی جدت کی مدد سے ذریعہ اظہار بنایا جاتا ہے۔ شعور کے ارتقاء میں جدت اور نئی سطح پر تخلیق کیا جانے والا ادب، ادب جدید کہلاتا ہے۔

پاکستان کی بات کی جائے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان سے وابستہ ہر شہری، مسلسل مارشل لاء کے مختلف ادوار سے متاثر ہوا۔ انسانی ذہن نے اس کے اثرات قبول کیے۔ یہی ہمارا عصری شعور ،مارشل لاء کے دور میں جنم لیتا اور پروان چڑھتا ہے۔ بلترتیب پہلے دنوں مارشل لاؤں نے انسانی فکر اور عصری شعور پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے لیکن تیسرے مارشل لاء نے انسانی شعور میں اس المیے کو خاصی اہمیت دی جو کہ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کی صورت میں رونما ہوا۔ اس کا شدید سے شدید تر در عمل ادبی حلقے میں دیکھا جا سکتا ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> ''ہماری نسل کے شعور نے مارشل لاء میں آنکھ کھولی، مارشل لاء میں جوان ہوئی اور مارشل لاء ہی میں بڑھاپے سے دوچار ہوئی۔''(۱۴)

جدیدیت کا فکری رجحان مغرب سے دیگر رجحانات کی طرح اردو ادب میں اس وقت در آیا، جب ترقی پسند تحریک کا اثر ورسوخ ماند پڑنا شروع ہوا۔ ۱۹۳۶ء سے شروع ہونے والی یہ ترقی پسند تحریک، تقسیم ہندوستان کے وقت پر اپنے عروج پر تھی۔ اردو افسانے کا موضوعات، فسادات اور تقسیم ہند کے نتیجے میں ہونے والے مصائب و الم تھے۔ معاشرے کا فرد تنہائی اور مایوسی کا شکار ہوا۔ یہی اثر ادباء نے بھی قبول کیا اور سوچ کے دھارے بدلنے شروع ہوئے۔ روایت سے انحراف، فرد کے لیے ہمیشہ ہی قابل قبول رہا ہے۔ اردو ادب میں نئے رجحان کو قبول کیا گیا۔ اردو ادب میں جدیدیت کا دخول اس وقت ہوا جب مغرب میں اس رجحان میں کمی واقع ہونا شروع ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ اس رجحان کا اثر شاعری اور نثر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک اردو افسانے کی روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کی مقبولیت کی کمی کے حوالے سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری یوں رقم طراز ہیں:

> ''اردو افسانہ ترقی پسند تحریک کی روش پر تقسیم کے المیے بیان کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اجتماعیت اپنا اثر کھونے لگی۔ انسان خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ ایسے میں ادیب و شاعر ترقی پسندی کے خول میں گھبراہٹ اور اکتاہٹ کا احساس کرنے لگے۔ جنگ،

امن، انقلاب معاہدہ جیسے الفاظ ذہنوں پر بوجھ بنتے گئے۔ خارجی عوامل، انسان کے باطن کو بے چین کرنے لگے۔ اکتاہٹ، اجنبیت، غیر مانوسیت، بے چینی و بے قراری، انقلاب آفریں نعروں کی گھٹن اور حبس بے جا کے شکنجے میں مقید، فرد کی فردیت اور اس کی قوت برداشت جواب دینے لگی۔ ان حالات میں نئی نسل کے ذہن میں روایت سے انحراف کے جراثیم کلبلانے لگے۔ نئی نسل کی اس خواہش کے عین مطابق جدیدیت کا رجحان سامنے آیا۔"(۱۵)

جدیدیت کے رجحان نے جہاں دیگر اصناف ادب کو متاثر کیا، وہیں اردو افسانے نے بھی جدیدیت کے اس اثر کو قبول کیا۔ جدیدیت نے کلاسیکی افسانے کی ہیئت، اسلوب اور خیالات کے اظہار کو نئی راہوں سے روشناس کروایا۔ اردو افسانے کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اردو افسانہ نگاروں نے نئی فکری زاویوں کو جدید تکنیک اور علامتوں کے ذریعے، فرد کے احساسات و جذبات کی ترجمانی مختلف علامتوں اور اسلوب کی جدت کی شکل میں کی۔

۱۹۵۸ء میں پہلے مارشل لاء نے پاکستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ ایک نئے اور جدید دور کے ساتھ ہی جدید افسانے کا آغاز ہوا۔ سیاسی جبریت کا یہ نتیجہ نکلا کے ادیب نے خارج کی وجہ سے داخل کی جانب توجہ دینا شروع کر دی۔ اسی بنا پر مصنف کی نظر میں کائنات اور زندگی کی حقیقت یکسر بدل گئی۔ فوجی آمریت کے ساتھ ہی اظہار رائے پر پابندی نے مزید مصنفین کو مجبور کر دیا کہ وہ علامتی پیرائے میں اپنے زبان و بیان اور ابلاغ کے عمل کو ممکن بنا سکیں۔ اس حوالے سے شہزاد منظر لکھتے ہیں:

"ملک میں جمہوریت کشی اور فوجی آمریت کے قیام کے ساتھ ہی زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ جس کی وجہ سے ادیبوں نے نیا طرز اظہار علامتی پیرایہ اختیار کر لیا۔ اس دور میں افسانے کی روایتی ہیئت کو توڑنے اور افسانے کو تجسیمی صورت کی جگہ تجریدی صورت دینے کی کوشش شروع ہوئی۔"(۱۶)

جدیدیت کا یہ نیا رجحان ان اردو کلاسیکی افسانے کے بنیادی عناصر میں تبدیلیوں کا باعث بنا۔ جس نے اردو افسانے کے پلاٹ، کہانی، مکالمہ نگاری اور زندگی سے متعلق افسانہ نگاروں کے نقطہ نظر بھی تبدیل کر دیا۔

جدید افسانہ نگاروں نے عصری زندگی خصوصی طور پر حالیہ صورت حال کو قلم بند کیا۔ حالیہ صور تحال میں ان تمام واقعات کا شمار ہوتا ہے، جن کا تاریخ میں اہم مقام ہے۔

موجودہ دور کے حالات، ماضی کے ادوار سے کافی حد تک مختلف ہیں۔ عالمی منظر نامے میں ہونے والا ردوبدل، پاکستان کی سیاسی صور تحال، پاکستان کو در پیش مسائل، آمریت، معاشی عدم مطابقت، جنگ ،آزادی اظہار رائے پر پابندیاں عائد کی گئیں نیز دہشت گردی اور عام آدمی کے مسائل، یہ تمام موضوعات جدید افسانہ نگاری کا حاصل ہیں۔

انور زاہدی نے دیگر افسانہ نگاروں کی طرح عصری صور تحال کو اپنے موضوعات کا حصہ بنایا ہے۔ انہوں نے ادب کو جدید عصری تناظرات میں دیکھنے کی سعی کی۔ سیاسی تناظر آپ کے ہاں کافی فعال نظر آتا ہے۔ آپ عالمی سیاسی صور تحال اور پاکستان کی سیاسی صور تحال سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وسعت مطالعہ اور تاریخ سے گہری دلچسپی، آپ کے افسانوں کا خاصہ ہے۔ اس تمام صور تحال نے معاشرے کے فرد کو کافی متاثر کیا اور یہ اثر فرد کی داخلی وخارجی سطح پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

" عذاب شہر پناہ" خاصی مقبولیت کا حامل افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں شامل تقریبا تمام افسانے بیسویں صدی کے اواخر کی صور تحال اور معاشرے سے وابستہ افراد کو کو در پیش مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ پاکستان کے سیاسی منظر نامہ کے نتیجے میں آمریت کے ادوار ہوں یا جمہوریت کی شکست وریخت، جابجا آپ کے افسانوں کا حصہ ہیں۔ عصری صور تحال کو مد نظر رکھتے ہوئے عام آدمی کو در پیش مسائل، جیسے جبریت، فرد کی بے توقیری، بے انصافی، ظلم و بربریت، معاشرتی اقدار کا زوال، گھٹن، غریبوں کا استحصال، معاشرے کی تقسیم ،عدم شناخت، تنہائی جیسے مسائل "عذاب شہر پناہ" کا حصہ ہیں۔ انور زاہدی نے بھی جدیدیت کے اثر کو قبول کیا اور یہی جھلک ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے ۔ مختلف موسموں کی کیفیات ،پرندوں، مظاہر فطرت کے استعاروں سے انہوں نے اپنے افسانے، عام قاری کے اذہان میں منکشف کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

موضوعات کے تنوع کی یہ خصوصیت آپ کو عصر حاضر کے افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ جدید افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

> ''موجودہ منظر پر نگاہ ڈالیں تو انتظار حسین، اسد محمد خان، رشید امجد، محمد منشایاد، حسن منظر، سلام بن رزاق، خالدہ حسین، مسعود اشعر، زاہدہ حنا اور فہمیدہ ریاض کے ساتھ آصف فرخی ڈاکٹر شیر شاہ سید، ڈاکٹر انور زاہدی، نیلم احمد بشیر اور

زاہد اقبال اردو افسانے کے دامن کو فکری، فنی، ہیئتی اور لسانی تنوعات سے آراستہ کر رہے ہیں۔"(۱۷)

پاکستان کی سیاسی صورت حال، قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد ہی مسلسل ابتری کا شکار رہی ہے۔ آمریت نے جمہوریت کو تار تار کیا۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کا ردعمل چونکہ زیادہ سخت نہیں تھا، عوام الناس نے اس سیاسی تبدیلی کو اپنے دکھوں کا مداوا سمجھا، مگر پھر دوسرے اور تیسرے مارشل لاء میں صورت حال یکسر تبدل ہو گئی۔ تیسرا مارشل لاء ۱۹۷۷ء کو نافذ ہوا جو کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کی کھلم کھلا خلاف ورزی پر مبنی تھا۔ جسے عوام الناس نے سخت ناپسند کیا۔ عوام کے جذبات واحساسات کی ترجمانی ادباء نے مزاحمتی ادب کی صورت میں کی۔ پاکستانی ادب کی صورتحال اور اسّی کی دہائی میں تخلیق ہونے والے ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے رشید امجد لکھتے ہیں:

"اسی کی دہائی مزاحمتی ادب کی دہائی ہے، مزاحمت تو عام معنوں میں ہمیشہ ادب کا حصہ رہی ہے، کہ ادیب ہر دور میں ظلم کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔ لیکن اسی کی دہائی کی مزاحمت، سیاسی جبر کے خلاف ایک عوامی ردعمل کی حیثیت رکھتی ہے۔"(۱۸)

انور زاہدی نے عصری شعور کا اظہار اپنے منفرد انداز میں بڑے احسن طریقے سے کیا اور ساری صورتحال میں بطور ادیب آپ نے بھی مزاحمت کے رویے کو اختیار کیا۔ اپنی بساط کے مطابق، سیاسی حالات میں اصل حقائق کو سامنے لانے کی سعی اور علامتی پیرائے میں ملکی فضا، عام آدمی کے جذبات واحساسات اور کیفیات کو الفاظ کے روپ میں ڈھالا۔ آپ کے متعلق ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

"انور زاہدی کا تخلیقی جھکاؤ جدیدیت کی طرف ہے۔ "عذاب شہر پناہ" میں شامل اکثر کہانیاں، علامتی انداز میں ان کے احساس اور مشاہدے کی ترجمانی کرتی ہیں، تاہم یہاں یہ علامیت، استعارہ سازی کے شوق میں نہیں بلکہ اظہار کے وسیلے کے طور پر سامنے آئی ہے۔" (۱۹)

ii۔ فرد کی بے توقیری:

تقسیم ہندوستان ایک ایسا واقعہ تھا جس نے انسانی تاریخ میں معاشرے کے افراد کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ہجرت کے دوران ہونے والا دنگا فساد، ظلم و بربریت، مذہبی تعصب کے نتیجے میں ہونے

والی انتقامی کارروائیاں الغرض انگنت ایسے واقعات جس میں انسانیت تار تار ہوئی۔ان تمام حوادث نے باہم یکجا ہو کر انسانی ذہن پر جو اثرات مرتب کئے، وہ قیام پاکستان سے اب تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ وقت ایک ایسا مرہم ضرور ہے جو کہ گزرنے کے ساتھ تمام زخموں کو بھرتا چلا جاتا ہے، مگر ان زخموں کی ٹیس اور نشان آج بھی بارڈر کے دونوں طرف دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ فسادات کے حالات و واقعات نے عوام الناس کو فکری و ذہنی سطح پر منتشر کر دیا۔ اس انتشار نے معاشرے کے سب سے حساس طبقے یعنی ادباء کے اذہان کو جکڑ لیا۔ تہذیبی گراوٹ، سماجی توڑ پھوڑ، معاشی پسماندگی، سیاسی حالات و واقعات میں ابتری، اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت جیسے تمام عوامل جب باہم یک جا ہوئے تو معاشرے کے افراد میں تنہائی، یاسیت، بے یقینی، فرد کے بے توقیر ہونے جیسے رویے، جنم لینا شروع ہو گئے۔ معاشرے کا فرد ذہنی سطح پر مفلوج ہو گیا۔ یہاں کے حالات نے ستم یہ کیا کہ فرد کی قوت گویائی بھی چھن گئی۔ ترقی جس قوم کا خواب تھی اب تنزلی مقدر ٹھہری۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں:

> ''آزادی کے متوالے اور وطن کے شیدائی، ان قیامت خیز اور جان لیوا تجربوں سے گزر کر بھی خوش رہتے، لیکن ظلم یہ ہوا کہ آزادی اور جمہوریت سے جس قسم کی توقعات وابستہ کی گئی تھیں، پوری نہ ہوئیں۔''(۲۰)

اس امر سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا کہ قیام پاکستان کے بعد عصر حاضر تک پاکستان کو سیاسی استحکام حاصل نہیں ہوا۔ مارشل لاء کے زمانے، پاک بھارت جنگیں، سقوط ڈھاکہ اور عالمی منظر نامے میں ہونے والی اہم تبدیلیاں، پاکستان کو درپیش اندرونی و بیرونی خطرات، ان سب عوامل نے معاشرے کے افراد کو ذہنی سکون اور آسودگی جیسی نعمت سے محروم کیے رکھا۔ اس ساری صورتحال کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''اندرون ملک بھی، حالات بہت تیزی سے بدلے ہیں۔ بار بار جمہوریت کی ناکامی اور آمرانہ اقدامات سے ملک کے سیاسی و اقتصادی استحکام میں خلل واقع ہوا ہے۔ بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ امیر غریب کا فاصلہ بڑھ گیا ہے اور بحیثیت مجموعی پوری قوم بے دلی، بے حسی کا شکار ہوئی۔۔۔ سماجی زندگی کے اور بہت سے گھٹیا روپ، سیاسی افراتفری، معاشی بدحالی، اقتصادی ناہمواری، عدم

مساوات، لاقانونیت، آمریت کی سختی، بد نظمی، رشوت ستانی اور چور بازاری کے نام بھی سامنے آئے۔"(۲۱)

سائنسی ترقی اور ملکی حالات میں روز بروز بڑھتی ہوئی بے چینی و بے یقینی کے عالم میں معاشرے کا فرد، داخلی اور خارجی سطح پر تنہائی اور منتشر الخیالی کا شکار ہے۔ جب انسان داخلی اور خارجی طور پر ناآسودگی کا شکار ہوتا ہے تو لاشعوری طور پر وہ گمشدگی کی کیفیت کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت کے عالم میں وہ مختلف سوال اٹھاتا ہے۔ کیسے؟ کیوں؟ کون؟ کب؟ کیا؟ کیوں کر؟ وغیرہ ان سوالات کا مقصد اور محور صرف اور صرف، بے توقیری کے احساس کو کم کرنا اور اپنا آپ ڈھونڈنے کی جستجو کرنا ہے۔

مارشل لاء کے پے در پے حملوں نے پاکستانی سیاسی حالات کو کبھی بھی مستحکم نہیں ہونے دیا۔ ان حالات میں کبھی مارشل لاء کا جبر مخفی نظر آتا ہے، تو کبھی ظاہری صورت میں عیاں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد مختلف مارشل لاؤں کے ادوار کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ضیاء اور مشرف کے مارشل لاؤں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ضیاء دور میں مارشل لاء کا جبر ظاہری سطح پر موجود تھا، سر عام کوڑوں کی سزائیں، سیاسی کارکنوں پر اٹک اور لاہور کے قلعوں میں تشدد، دانشوروں سے غیر انسانی سلوک، نے ملک کی مجموعی فضا میں جو خوف و ہراس پیدا کیا، اس کے اثرات ہر طرف دکھائی دیتے تھے، لیکن مشرف کے مارشل لاء میں اس طرح کی ظاہری صورت موجود نہ تھی البتہ نائن الیون کے بعد لوگوں کی پراسرار گمشدگی نے اس کی ظاہری شکل بھی واضح کر دی۔"(۲۲)

انور زاہدی نے مارشل لاء کے مختلف ادوار دیکھے اور ان کے اثرات بھی انور زاہدی کی فکر پر مرتب ہوئے۔ افسانوی مجموعہ "عذاب شہر پناہ" بھی ان ہی فکری رجحانات کا احاطہ کرتا ہے۔ فرد کو داخلی اور خارجی سطح پر درپیش مسائل کو زیر بحث لانا ہی آپ کی پہچان بنا۔ آپ نے تیسری دنیا کے انسان کے کرب کو اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ آپ کے باقی تینوں افسانوی مجموعے، "موسم جنگ کا کہانی محبت کی"، "مندر والی گلی"، اور "بائسکوپ دن" ماضی کی سہانی یادوں، ماضی بعید اور ماضی قریب کے اہم واقعات، سانحات، ارضی و سماوی آفات اور زندگی کے عارضی پن جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ "عذاب شہر پناہ" کے متعدد افسانے فرد کی بے توقیری کو بیان کرتے ہیں۔ انور زاہدی مختلف کرداروں کے قالب میں سماجی، سیاسی اور معاشی صورتحال

کو کمال مہارت سے پیش کرتے ہیں۔"دوسرے سیزر کی موت"،"شہر بدر ہم زاد"،" وبا"،" کھلا مین ہول"،" عذاب شہر پناہ"،"سرنگ"اور"صور تحال"ایسے افسانے ہیں جو کہ فرد کی کیفیت، معاشرے کے جمود، جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں۔

فرد کی بے توقیری کے حوالے سے یہی صور تحال "آگہی اور دوسرا آدمی" میں دکھائی گئی ہے۔ جس میں "وہ" کا کردار کوئی نام نہیں رکھتا۔ بظاہر وہ ایک نوجوان ہے جو یہ کردار ادا کر رہا ہے جو کہ ایک حادثے میں اپنی یاداشت کھو بیٹھتا ہے اور خود کو شناخت نہیں کر پاتا۔ مصنف نے اس نوجوان کو پوری نوجوان نسل کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ جس کی سمت متعین نہیں، اس کا کوئی رہنما نہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو معاشرے کا ایک ایسا ناسور سمجھتا ہے جو کہ تمام برائیوں کی جڑ ہے:

> "کہانی پر کہانی بدل رہی ہے، کردار پر کردار ابھر کر سامنے آرہے ہیں، مگر کہانی کے کردار کی شکل میں وہ خود موجود ہے۔ اسے الٹی آرہی ہے۔ لوگ کہہ رہے ہیں، اس کے سر پر سخت چوٹ آئی ہے۔۔۔ یہی وہ سوچ رہا تھا کہ ،"وہ" کیوں اب تک زندہ ہے۔"(۲۳)

جب انسان کی ذات کا کوئی مقصد نہ ہو، بے یقینی، تنہائی، فرسٹریشن جیسے عوامل اس کی ذات کو گھیرے ہوئے ہوں۔ گھٹن سے فرار اور زندگی میں رمق باقی نہ ہو تو پھر اس زندگی سے بہتر انسان کو موت ہی نظر آتی ہے۔ انسان جیتے جی مرنے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ یعنی معاشرے میں اس کا موجود ہونا، نہ ہونا اس کے لیے اور معاشرے کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

افسانہ "دوسرے سیزر کی موت" میں مارشل لاء کی جبریت، معاشرے کے افراد کا استحصال، بے یقینی، ذہنی انتشار جیسے موضوعات کو یکجا کیا گیا ہے۔ ایک تمثیلی کہانی کے بہروپ میں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے سانحے کو قلم بند کیا گیا ہے۔ جبریت کے زیر اثر معاشرے کے افراد، اندھے اور بہرے ہو گئے ہیں، کسی میں بھی اتنی ہمت اور سکت باقی نہیں کہ ظلم اور بے حسی کا مقابلہ کر سکے۔ کانوں سے عاری لوگ بے سمت بھاگے جا رہے ہیں۔ عجیب افراتفری کا عالم ہے۔ بھٹو کی پھانسی کے وقت، حالات کے بارے میں انور زاہدی اس بے حس، بے ضرر، اندھے اور بہرے معاشرے کی عکاسی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''بغیر کانوں کے لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ سیانوں میں سے کسی
ایک نے جو دوسرے کے کان جمع کرتا رہا ہے، چپکے سے سگنل کی تینوں آنکھوں کو
نکال دیا ہے۔ شہر کے چوراہے کا سگنل اب نابینا ہو چکا ہے۔''(۲۴)

فرد کی بے توقیری جیسے المیے کو آپ نے اپنے دیگر افسانوی مجموعوں میں بھی بیان کیا ہے۔ اپنے تیسرے افسانوی مجموعہ "مندر والی گلی" میں بھی مصنف نے فرد کی بے توقیری اور اس معاشرے میں اس کے وجود اور مقام کو بیان کیا ہے۔

افسانہ "ایک ایکسٹرا کہانی" کے مرکزی کردار عبدالحمید عرف "میدو" کے گرد گھومتی ہے۔ مصنف نے میدو کے کردار کے ذریعے غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والے لڑکے کی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر بیان کیا ہے۔ ہمارا معاشرہ اور اس کی باسی کیسے غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والے افراد کا استحصال کرتے ہیں۔ صاحب ثروت افراد ایک عام آدمی اور اس کی خواہشات، معاشرے میں اس کا مقام، اسے دینے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ کہانی اس سماج، ہمارے سسٹم اور انتظامیہ کے منہ پر ایک طمانچہ ہے، جو سسٹم صرف اور صرف اعلیٰ طبقے کی سہولت اور اسے سپورٹ کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ عام آدمی کے لیے وہ صرف اور صرف وبال جاں ہے۔ عام آدمی کی موت اور محرومیوں سے اسے کوئی خاطر خواہ فرق نہیں پڑتا۔ عدلیہ، انتظامیہ یا مقننہ کو اس غریب آدمی سے

کوئی سروکار نہیں۔ یہ کہانی ایک سٹوڈیو سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں پر، میدو، نام کا ایک بیرا سٹوڈیو میں کام کرنے والے عملے کو چائے تقسیم کرتا اور چائے کے برتن اکٹھے کرتا ہے۔ کبھی یہاں اور کبھی وہاں نظر آتا ہے۔ اسی بنا پر میدو سے سٹوڈیو میں تقریباً ہر شخص واقف تھا۔

میدو کا تعلق ایک گاؤں سے تھا۔ اسے اداکار بننے کا شوق گاؤں سے شہر لے آیا تھا۔ وہ بظاہر ایک کسان کا بیٹا تھا مگر اس کے خوابوں نے اسے اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے خوابوں نے اس سے اس کا گھر چھڑوایا۔ بہت چھوٹی عمر میں ایسے کئی جتن کروائے۔ نانبائی کی دکان پر کام ہو یا بیوٹی سیلون کی دکان پر بطور ہیلپر، میدو نے فلم میں کام کرنے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ہر وقت اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال رہتا ہے کہ ایک دن وہ ایک عظیم اداکار بنے گا۔ ان سب کاموں کے دوران جب اسے فرصت ملتی تو اسے گھر کی یاد بہت ستاتی تھی مگر اس کے خواب اسے گھر جانے سے روک دیتے:

شہر کی زندگی اور لوگوں کے رویوں نے میدو کو مختلف مواقع کی مناسبت سے جھوٹ بولنا سکھادیا تھا۔ وہ بتدریج اداکاری کے مراحل طے کرتا چلا گیا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا جب میدو کو ایک فلم میں شوٹنگ میں کسی ایکسٹرا کے نہ آنے اور اپنے جوہر دکھانے کا موقع مل گیا۔ وہ ایک کینٹین کے بیرے سے ایک ایکسٹرا اداکار بن گیا۔ اداکاری کے جوہر دکھا کر، اس نے تمام عملے کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی اور یوں فلموں میں کام ملنے لگا۔ کئی بار اس کے دل میں یہ خیال ضرور پیدا ہوا کہ وہ اپنے گھر جائے کیونکہ اس کا خواب پورا ہو چکا تھا، مگر مصروفیات کی بدولت وہ ایسا کرنے سے قاصر رہا۔

ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران میدو کو ایک ڈاکو کا کردار نبھانا پڑا۔ ویسے تو وہ اپنا یونیفارم ہر روز تبدیل کرتا، مگر مگر اس رات شوٹنگ ختم ہونے کے بعد اس نے اپنا لباس تبدیل نہیں کیا۔ آج وہ یونیفارم کی حالت میں مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات کافی ہو چکی تھی ہر طرف سناٹا تھا۔ لوڈشیڈنگ کی بدولت بجلی نہیں تھی۔ سڑکیں گھپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔ پولیس کی گشت پارٹی کسی مجرم کی تلاش میں تھی۔ شدید فائرنگ نے میدو کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس پر فائرنگ کیوں ہو رہی تھی۔ جنرل ہسپتال کے شعبہ حادثات میں پولیس ایک زخمی ڈاکو کو داخل کرا گئی تھی، جو کہ زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔ وہ اپنے حلیے سے ایک ڈاکو ہی لگتا تھا، صرف ایک سرجیکل ہسٹری لکھنے والا نوجوان ڈاکٹر یہ جانتا تھا کہ زخمی ڈاکو دراصل ڈاکو نہیں تھا بلکہ مصنوعی گیٹ اپ میں ایک اداکار ہے۔ جو زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بعد ازاں تمام ڈاکٹروں کو اس بات کا علم ہوا جب نقلی مونچھیں، نقلی بھوئیں اور بڑے بالوں کی وگ دوران معائنہ اتار لی گئی:

> ''وہاں موجود ڈاکٹروں پر یہ بھید کھلا کہ پولیس محض اپنی کاروائی دکھانے کے لئے ایک شریف اور معصوم شہری کو مار لائی ہے۔''(۲۵)

"میدو" کی موت نے کسی پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ مصنف کی یہ کہانی، ہمارے معاشرے میں فرد کی بے توقیری کو عیاں کرتی ہے۔ ہمارے ہاں پولیس اور دیگر انتظامیہ پر انگلی اٹھاتی ہے۔ اصل مدعا کو بیان کرنے کی بجائے کہانی کو نیا اور الگ تھلگ رنگ دے کر پیش کیا جاتا ہے۔ خوف اور ڈر سے فائدہ اٹھا کر اپنی مرضی کی رپورٹیں اور کاروائیاں افسران بالا کے حضور پیش کی جاتی ہیں۔ اعزازی اسناد کے حصول اور انعام واکرام کی غرض سے حقیقی واقعات کو چھپایا جاتا ہے۔ ایسی پولیس اور انتظامیہ کیسے ایک عام آدمی کو تحفظ فراہم کر سکتی ہے،

جو کہ ایک عام آدمی کا آئینی اور قانونی حق ہے۔ یہ فرد کی بے توقیری نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا عدلیہ اور قانون اس کی ذات کے محافظ نہیں؟ تو ان کے وجود اور قیام کے اور کیا مقاصد ہیں؟

iii۔ عدم شناخت:

عصر حاضر میں جہاں بہت سارے عناصر معاشرے کے افراد کو کرب میں مبتلا کرنے کا باعث بنتے ہیں، وہیں ایک عنصر عدم شناخت یعنی پہچان کا گمشدہ ہونا ہے۔ مشینوں کے اس دور میں فرد بے چہرگی کا شکار ہے۔ اس مشینیت نے سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس ماحول کے عناصر نے فرد کے تصور زندگی کو اور اس کے ساتھ اس کے نظریات کو بھی یکسر بدل ڈالا ہے۔ انسان مشین کے ایک الگ تھلگ پرزے کی طرح ہو گیا ہے۔ اپنی ہستی اور پہچان سے محرومی، انسان کا مقدر ٹھہری ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

> ''جدید اردو افسانے نے پہچان کی گمشدگی کے اس المیے کو مختلف انواع طریقوں سے پیش کیا ہے۔ یہ موضوع جدید افسانے کے چند اہم ترین موضوعات میں سے ایک ہے۔ جدید افسانے کے بے نام کردار دوسروں سے اپنا نام اور پتہ پوچھتے ہیں۔ ان کے چہرے یا تو مسخ ہو چکے ہیں یا ان کے خدوخال معدوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ اپنے چہرے چھپائے یا پھر ان پر مانگے تانگے کے چہرے چسپاں کیے، پریشان حال اور سرگرداں ہیں۔''(۲۶)

انسان کا دوغلا چہرہ اور اس کی دوغلی شخصیت کے حجاب نے انسان میں چھپے حیوان اور مطلب پرست انسان کو چھپا رکھا ہے۔ انفرادی فائدے کو اجتماعی فائدے پر فوقیت دی جائے تو یہ معاشرہ ایسے ہی افراد کو پیدا کرتا ہے، جن کی ذہنیت میں مادیت پرستی ہی حاصل زندگی ہے۔

اسی تناظر میں ڈاکٹر رشید امجد اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''عصر حاضر کا فرد ماضی اور مستقبل میں پھنس چکا ہے۔ نہ وہ اپنے ماضی جیسا تابناک ماضی حاصل کر سکتا ہے اور نہ مستقبل کی چکاچوند رنگینیوں سے پیچھا چھڑا سکتا ہے۔ اسی کشمکش میں انسان کی اپنی پہچان گم ہو گئی ہے۔ بظاہر تو انسان ترقی کی منازل طے کر رہا ہے مگر در حقیقت تنزلی ہی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔''(۲۷)

مشینی انقلاب کی بدولت معاشرے میں پھیلنے والی برق رفتاری، مادیت پرستی، کاروباری ذہنیت جیسے تمام عوامل نے انسان کو اس کے راستے سے بھٹکا دیا ہے۔ انسان بے سہارا ہو گیا ہے۔ یہ سارا نظام فرد کو فردیت سے دور کرنے کا باعث بن رہا ہے۔

بعد ازاں وقت کے ساتھ اردو افسانے میں نئے موضوعات اور رجحانات کا اضافہ ہوتا گیا۔ ان مسائل میں معاشرے کے سماجی، معاشی، معاشرتی مسائل کے علاوہ، سیاسی مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ اردو افسانے میں ستر کی دہائی کو اہم قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد ۷۰ء کی دہائی میں تخلیق کیے جانے والے افسانے کا ذکر کرتے ہوئے، عدم شناخت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ستر کی دہائی کے افسانے میں شناخت کا مسئلہ موجود ہے۔ لیکن اس میں اب وجودی اثرات بھی شامل ہو گئے تھے۔ فرد کی جگہ اجتماعیت نے لے لی تھی، لیکن گمشدگی کا احساس اب بھی موجود تھا۔ یہ گمشدگی کسی لاشعوری احساس کا نتیجہ تھی۔''(۲۸)

اپنے کئی افسانوں میں آپ نے بے چہرہ لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ عصر حاضر کا فرد اپنے آپ کی کھوج میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ بے چہرگی کی یہی کیفیت انور زاہدی کے چاروں افسانوی مجموعوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں پر آج کا انسان اپنا آپ تلاش کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ موجودہ حالات کی سختی اور بہت سے مسائل نے انسان کو اس کی اپنی شناخت سے محروم کر دیا ہے۔

داخلی و خارجی سطح کے مسائل نے انسان سے اس کی قوت گویائی چھین لی۔ انسان اندر ہی اندر گھٹن کا شکار ہو گیا اور یہی گھٹن جب ظاہری طور پر سامنے آئی تو انسان نے اپنی شناخت کو کھوتے ہوئے پایا۔ ''خواب سا دن'' افسانہ بھی ایک ایسی ہی فضا کو جنم دیتا ہے۔ یہ افسانہ اپنی نوعیت کا انوکھا افسانہ اس لیے بھی ہے کیونکہ اس میں 'صیغہ واحد متکلم' اپنی پہچان مکمل طور پر کھو چکا ہے اور ماضی کے دریچوں میں اپنی پہچان کو ڈھونڈتا پھرتا نظر آتا ہے۔ جسے آج کے زمانے میں کہیں بھی اپنا آپ دکھائی نہیں دیتا:

> ''میرے چاروں طرف ریت کے بگولے رقص کر رہے ہیں۔۔۔ میرے چہرے کو صحرا میں ''چلتی ہوئی باد سموم جھلس رہی ہے۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔ آخر یہ سب کیا ہے۔۔۔؟ میں کہاں آ گیا ہوں۔۔۔؟ یہ کون لوگ ہیں۔۔۔ اس سے لگتا تھا، جیسے وہ مجھ سے ہی نہیں بلکہ میرے ماضی اور حال سب کی خبر رکھتے ہیں ''۔۔۔(۲۹)

عصر حاضر میں معاشی بدحالی، طبقاتی کشمکش، معاشی نظام میں عدم مطابقت، یہ تمام ایسے حاصلات ہیں جو کہ معاشرے میں پائی جانے والی ان خرابیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اس دور کے فرد کی معاشی آسودگی اور راتوں رات امیری کے خواب دیکھنے، جائز و ناجائز طریقوں سے دولت ہتھیانے اور معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا، یہی تمام خواہشات اس دور کے فرد کا حاصل زندگی ہیں اور یہی مقصد و محور ہیں۔ آمدن کا حصول جائز طریقے سے بھی ممکن ہو تب بھی خود کا دوسروں سے موازنہ کرنا اور اس دوڑ میں ان تمام معاشرتی روایات سے بغاوت کا رجحان سامنے آنا، فرد اس ذہنی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ فرد خود کو اکیلا سمجھتا اور اپنے آپ کو اپاہج محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کی یہ ذہنی بیماری مختلف طریقوں سے ان رویوں کو جنم دیتی ہے، جو کہ ایذاءرسانی، افراتفری، عدم تحفظ اور انفرادیت کا قیام عمل میں لانے کا باعث بنتی ہے۔

معاشرہ افراد کے باہمی ملاپ سے بنتا ہے، کیونکہ انسان معاشرے میں تب ہی ایک کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے جب وہ اس معاشرے کے افراد کے ساتھ مل کر زندگی گزارے۔ معاشرے کی روایات، رسمیں، اصول و ضوابط سب افراد ہی کی وضع کردہ ہوتے ہیں۔ یہ تمام رسوم و روایات اگر فرد پر حاوی ہونا شروع ہو جائیں، تو یہ افراد کو کافی حد تک متاثر کرتی ہیں۔ اگر معاشرہ اعلیٰ اقدار، بہترین رسوم و رواج کا حامل ہو گا، تو فرد واحد یقیناً اس معاشرے میں ذہنی طور پر مضبوط اور مثبت سوچ کا حامل ہو گا۔

اگر معاشرے کے افراد میں دولت کی ہوس، انفرادیت، بدنظمی، ذہنی انتشار، رشوت خوری، افراتفری، ظلم و بربریت، ناانصافی جیسے عناصر جنم لیں گے، تو معاشرے کا اثر قبول کرنے والا فرد یقینی طور پر خود کو اجنبی یا (Out Sider) تصور کرے گا۔ ان افراد کی زندگی میں اپنی شناخت کی گمشدگی اور بے معنویت کا کرب ضرور دیکھنے میں آئے گا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

> ”فرد اور معاشرے کی آویزش کو اس وقت زیادہ بڑھاوا ملتا ہے، جب فرد اور معاشرے میں فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے فرد معاشرے میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔ تنہائی، یاسیت، قنوطیت اس کا گھیراؤ کر لیتی ہیں۔ بلکہ وہ عدم تحفظ کی زد میں آکر بے معنویت اور پہچان کی گمشدگی کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے“(۳۰)

معاشرے اور فرد کے مابین اسی کشمکش کو انور زاہدی نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بدولت اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے۔ آپ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ جتنا انسان کا رشتہ اس کے معاشرے کے ساتھ مضبوط

ہو گا اور جتنی اس کی سوچ مثبت ہو گی، وہ معاشرے کے لئے اتنا ہی سود مند ثابت ہو گا۔ ان کے افسانوں میں ایسے معاشرے کا احوال بیان ہوا ہے جو کہ مادیت پرستی، مشینیت، افراتفری، بے حسی، سیاسی انتشار اور انتہا پسندی کا گہوارہ ہے اور یہ معاشرہ براہ راست افراد پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ آپ کے نزدیک معاشرے کے افراد کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

اس معاشرے سے وابستہ افراد میں تنہائی کا کرب، بے چہرگی، مایوسی، بے کسی اور عدم شناخت جیسے عوامل کا پایا جانا ایک فطری عمل ہے، کیونکہ معاشرہ براہ راست افراد پر اثر انداز ہوتا ہے، جتنی معاشرے کے افراد میں عدم مطابقت پائی جائے گی، معاشرہ اس قدر خستہ حالی کا شکار ہو گا۔ مذکورہ بالا عوامل کی موجودگی میں افراد بے چہرگی کا شکار ہوتے ہوئے خود کو اس گہری اور تاریک سرنگ میں پاتے ہیں، جہاں ہر کوئی بے چہرہ اور عدم شناخت کا شکار ہے۔ اپنے افسانے "سرنگ" میں مصنف انسانی زندگی کو ایک سرنگ کے طور پر پیش کر رہے ہیں، جس میں ہر طرف صرف اور صرف گھٹن ہے، انسان کو کوئی امید کی کرن نظر نہیں آتی:

> ''میری یاداشت میری کمزوری بن گئی ہے۔۔۔ مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں کہ میں کب سے اس سرنگ میں ہوں اور ہاں تم بھی، میرے ہی ساتھ اس سرنگ میں رہتے ہو۔۔۔ لگتا ہے اس سرنگ میں بس ہم دونوں ہی جاندار موجود ہیں۔۔۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر بات ہماری سمجھ میں آجائے۔۔۔ بہت سی باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔۔۔ تمہارا کیا مطلب ہے۔۔۔؟ کیا ہم ہمیشہ سرنگ میں رہیں گے۔۔۔؟ آگے کون جانے۔۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔ میں خود یہاں کب سے موجود ہوں۔''(۳۱)

انور زاہدی کے افسانوں میں شناخت کا مسئلہ بنیادی موضوع کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ان کے ہاں شناخت کی جہتیں مختلف نوعیت کی ہیں۔ یہ شناخت کا مسئلہ فرد کی ذات کے حوالے سے بھی ہے اور اجتماعی سطح پر بھی سامنے آتا ہے۔ "عذاب شہر پناہ" کے کئی افسانوں میں عدم شناخت سے دوچار فرد دیکھا جا سکتا ہے۔ جن افسانوں میں "سرنگ"، "عذاب شہر پناہ"، "بارش"، "کھلا مین ہول"، جیسے افسانے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فرد کی گمشدگی کے حوالے سے "سرد ہوا"، "بھاگتا ہوا دن"، "شہر بدر ہمزاد"، "مٹی کی بو"، "نئے شہر کے معنی"، "بے انجام کہانی" جیسے افسانے اہم ہیں۔ فرد کا ہونا یا نہ ہونا، ایک عجیب سی بے چینی کی کیفیت سے دوچار معاشرے کا یہ فرد اپنی حالت زار پر نوحہ کناں ہے۔

صحیح سمت کا تعین، بے یقینی کی دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ منزل کا نظروں سے اوجھل ہونا، فرد کے اندر اضطراب اور بے چینی جیسی کیفیات کو جنم دیتا ہے۔ معاشرہ جمود اور اخلاقی پستی کی طرف کھنچتا چلا جارہا ہے۔ مصنف کا ایک افسانہ "ادھڑی ہوئی سڑک" بھی اسی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ اسے، تاریخ، اور مہینوں سے کچھ غرض نہیں، نہ ہی اسے جگہ کا پتہ ہے کہ وہ اس وقت کہاں موجود ہے؟ اس کا رخ کس طرف ہے؟ منزل کی حقیقت اس سے کوسوں دور ہے، اور وہ ادھڑی ہوئی سڑک پر اب بھی گرد کے چھٹنے کا منتظر کھڑا ہے:

لیکن وہ خود بھی تو ایک زمانے سے سڑکوں پر پھر رہا ہے۔۔۔ بھلا کب سے؟ کتنے دن ہو گئے؟

جب معاشرہ جمود کا شکار ہو جائے، انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماند پڑ جائے، معاشی و معاشرتی سطح پر فرد کا استحصال اپنے عروج پر ہو، تو انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کی سوچ کو اب پھپھوندی لگ چکی ہے:

> "کئی بار وہ سوتے میں چونک کر جاگ اٹھتا، اسے لگتا کہ اس کے اندر پھپھوندی لگ چکی ہے۔ کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچتا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ پھپھوندی انسان کے دماغ کو لگ جاتی ہو اور پھر اسے ہر چیز میں پھپھوندی لگی نظر آتی ہو۔"(۳۲)

اس بے یقینی کی کیفیت میں فرد کی یاداشت کبھی اسے یاد ماضی کے دریچوں میں جھانکنے پر مجبور کرتی ہے، تو کبھی ماضی سے حال تک کے سفر پر اکساتی ہے۔ یاداشت کا لوٹنا اور پھر سے گم ہو جانا انسان کی ذہنی سطح کا عکاس ہے۔ حال میں رہتے ہوئے انسان کا اپنے ماضی سے رشتہ ہی وہ اٹوٹ رشتہ ہے جو اسے حال میں جینے کا سہارا فراہم کرتا ہے۔ یہ رشتہ اسے پھر سے تازہ دم اور ذہنی طور پر مضبوط کرتا ہے۔

یہ ایک فطری عمل ہے کہ اگر انسان اپنے حال سے مطمئن اور خوش نہیں ہو گا تو اسے اپنا ماضی یاد آئے گا۔ وہ اپنے ماضی کی یاد میں سکون محسوس کرے گا۔ اس ساری صورتحال میں فرد کے ذہن میں مختلف سوالات جنم لیتے ہیں کہ اس معاشرے میں اس کا مقام کیا ہے؟ اس کی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ آیا کہ یہ وہی زندگی ہے جس کا وہ خواہاں تھا؟

اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے آپ اپنے ایک افسانے "پسِ دیوار" میں زندگی کی حقیقت سے متعلق یوں گویا ہیں: "کیا زندگی در حقیقت وہ ہے جو ہمیں بظاہر دکھائی دیتی ہے۔ یا وہ جس کے بارے میں ہمیں اب تک کوئی علم نہیں۔"(۳۳)

"پس دیوار" افسانے میں مصنف نے ایسی ہی صورتحال کو قلمبند کیا ہے کہ فرد کے ذہن میں اس طرح کے سوالات کا پیدا ہونا اس سماج کی دین ہے۔ جس طرح وہ حال میں اپنی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ مصنف کا ایک اور افسانہ ''بے چہرہ کہانی'' موجودہ دور میں ہر فرد کو درپیش مسائل کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ داخلی و خارجی جبر، تنہائی، مایوسی، خوف، عدم تحفظ، عدم شناخت الغرض وہ تمام مسائل جن سے عصر حاضر کا فرد شکار ہو چکا ہے۔ سب اس ماحول کا اثر ہے جو کہ موجودہ نظام کا پیش خیمہ ہے:

> ''لوگ ایک دوسرے سے بیزار، ناآشنا اپنے اپنے خول میں چھپے، جلتی دھوپ میں اِدھر سے ادھر سفید چوہوں کی طرح سرگرم، جنہیں ایک دن طبّی تجربہ گاہوں میں تحقیق کی نذر ہو جانا پڑ جاتا ہے۔ معصوم بے زبان سفید چوہے ''(۳۴)

معاشرے کا نوجوان طبقہ بھی ان منفی رجحانات سے نہیں بچ پایا۔ اس معاشرتی صورتحال نے اس معاشرے کے جوان طبقے کی، زندگی سے محبت کو چھین لیا۔ آخر کو ان نوجوانوں نے مستقبل میں اس معاشرے کا ایک ذمہ دار شہری بننا ہے۔ اس معاشرے کے نزدیک ان کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں۔ اسی وجہ سے نئی نسل بھی عدم شناخت اور عدم تحفظ کا شکار ہے۔ "آگہی اور دوسرا آدمی" ایسا افسانہ ہے جس کا مرکزی کردار "واحد متکلم" اسی کیفیت سے دوچار نظر آتا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''وہ اپنے بستر پر بے چین ہوا، جیسے وہ سب کچھ سن رہا تھا اور جانتا تھا کہ اگر شناختی کارڈ مل بھی جاتا تو کیا فرق پڑتا، وہ خود ابھی تک اپنی شناخت نہیں کر سکا۔ ''(۳۵)

انور زاہدی اپنے آج میں اپنا کل ڈھونڈنے کے لیے سرگرداں ہیں۔ ''بے چہرہ کہانی'' بھی انور زاہدی کی بہترین کہانیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں وہ پرانے شہر کو ڈھونڈتے ہوئے نظر آتے ہیں جو کہ اب انہیں ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ کیوں کہ اس پرانے شہر میں ان کی کوئی شناخت تھی۔ اس شہر کے لوگ بے چہرگی، عدم شناخت کی کیفیت سے دوچار نہیں تھے مگر اب صورتحال یکسر بدل گئی ہے:

> ''اگر یہ وہی شہر ہے یہاں تو سب کچھ بدل چکا ہے، اب نہ یہاں وہ پرانے درخت موجود ہیں اور نہ ان پر بیٹھنے والے خوش رنگ چہچہاتے پرندے۔۔۔

میرے خیال میں نئے تمدن میں درختوں اور پرندوں کی کوئی جگہ نہیں۔ تو کیا
میں بھی پرانا درخت۔۔۔؟"(۳۶)

iv۔ یادِ ماضی:

انور زاہدی نے اپنی افسانوی نثر میں تیسری دنیا کے انسان کے جذبات و احساسات کو بھی اپنے موضوعات کا حصہ بنایا ہے۔ عصر حاضر کے انسان کو درپیش مسائل، ان مسائل سے چھٹکارا اور صبح نو کی نوید انور زاہدی کے افسانوں کو پرتاثیر بناتی ہے۔ انور زاہدی جب اپنے چہار اطراف نظریں دوڑاتے ہیں تو معاشرے کا بکھراؤ، تہذیبی و اخلاقی اقدار کا زوال، بدعنوانی، ظاہر و باطن میں تضاد انہیں بے چین کرتا ہے۔ اسی بے چینی کے سد باب کے لیے وہ ماضی کا سہارا لیتے ہیں۔ اپنے حال کا اپنے ماضی سے تقابل کرتے ہیں۔ اپنے ماضی سے استوار رہنا، وہ سہارا ہے جو اس نئی ترقی یافتہ بلکہ ترقی پذیر دنیا میں انہیں جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ اسی کیفیت کو انور زاہدی افسانوی مجموعے "بائسکوپ دن" کے تعارف میں کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

"میرے لاشعور میں بسا میرا بچپن اور اچھے دن کبھی یادوں سے محو نہ ہو
سکے۔۔۔ شاید انہی دنوں کی یادیں۔۔۔ مجھے ایک خوش آئند زندگی کی خواہش
میں ایک نیا دن۔۔۔ نئے عہد کو دیکھنے کی جستجو پر آمادہ کرتی رہیں۔۔۔ یا یوں
کہہ لیں کہ زندہ رہنے پر مجبور۔۔۔ جانے کہاں گئے وہ دن۔۔۔؟"(۳۷)

ادب کا مقصد انسان اور اس کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرنا ہے، اور اس کے احساسات و جذبات کو الفاظ کا روپ دینا ہے۔ مصنف جو محسوس کرے، معاشرہ جو اسے دے، وہ اپنی سوچ کی بدولت ضبط تحریر میں لائے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر اقبال آفاقی لکھتے ہیں:

"جب مستند ادیب کردار تخلیق کرتا ہے، تو ان کی مدد سے اپنے وجود کا سراغ
لگاتا ہے۔ جب وہ کہانی لکھتا ہے تو وہ دوسروں کی کہانی نہیں لکھتا، بلکہ اپنی ذات
اور صورتحال کے مختلف پرت کھولتا چلا جاتا ہے۔"(۳۸)

انور زاہدی نے اپنے افسانوں میں اپنے ماضی کو، مختلف کرداروں کی مدد سے اپنے حال کا حصہ بنایا ہے۔ وہ اپنے حال کا اپنے بیتے ماضی سے تقابل کرتے نظر آتے ہیں۔ ماضی میں جھانکنا، انہیں ذہنی آسودگی فراہم کرتا ہے۔ عالمی منظر نامے اور ملک کی صورتحال میں ہونے والی تبدیلیاں اور ان کے منفی اثرات، عام آدمی کو متاثر کرتے ہیں۔ انور زاہدی ماضی کا سہارا لے کر انسان کا اپنے ماضی سے رشتہ استوار کرتے ہیں۔ راحت و سکون ،ایثار و محبت جیسے عظیم احساسات سے اپنے قاری کو پر امید رکھتے ہیں۔ ماضی کی بازیافت سے متعلق انور زاہدی کے بارے میں محمد حمید شاہد یوں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر انور زاہدی کے افسانے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے، جیسے ان کے کرداروں کا خمیر اس کے اپنے بچھڑ چکے ماضی سے اٹھا ہے۔ یوں کہ جب بھی وہ پلٹ کر ماضی میں جاتا ہے اور ماضی کے ان کرداروں، گلیوں اور منظروں سے بات کرتا ہے تو اس سارے منظر نامے کے ایک ایک جزو کو بڑے استعجاب سے ایک اجنبی کی طرح بھی دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اسٹل لائف، مینار سکوت، زندگی کہیں اور ہے، ٹوپچ اور پرسے کے گرد میں اٹا سفر، میں اس کی بھرپور مثالیں ہیں۔''(۳۹)

انور زاہدی کے ہاں افسانہ مسلسل ارتقائی مراحل طے کرتا نظر آتا ہے۔ آپ نے بیسویں صدی کی اواخر میں، آخری دو دہائیوں میں وقوع پذیر ہونے والے اہم واقعات کو بطور موضوع، اپنی افسانہ نگاری میں جگہ دی۔ ملکی سیاسی حالات ہوں یا انسان کو داخلی و خارجی سطح پر درپیش مسائل، سب ہی انور زاہدی کے افسانوں کا حصہ ہیں۔ پہلے دو افسانوی مجموعوں میں عصر حاضر کے سیاسی حالات اور جنگ و جدل کو بطور خاص موضوع تحریر بنایا گیا ہے۔ علامت کو اظہار کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اپنے پہلے مجموعے میں اپنے صرف ۷۰ اور ۸۰ کی دہائیوں میں وقوع پذیر ہونے والے اہم واقعات کو قلم بند کیا۔ ''عذاب شہر پناہ''، ''موسم جنگ کا کہانی محبت کی'' بیسویں صدی کے اواخر میں منظر عام پر آئے۔ بعدازاں ''مندر والی گلی'' اور ''بائسکوپ دن'' اکیسویں صدی عیسوی میں شائع ہوئے، دونوں افسانوی کتب میں انور زاہدی کے ہاں ناسٹلجیائی عناصر کو خاصی اہمیت دی گئی ہے۔

اپنے گھر سے دوری ہو یا دوران ملازمت بیرون ملک کا سفر ہو، اپنے ملک اور اپنے گھر کی یادیں ہمیشہ انور زاہدی کے ساتھ رہیں، آپ کے ہاں مختلف واقعات اور کرداروں کی مدد سے یاد ماضی کا بیان اور ماضی سے وابستگی

دیکھی جاسکتی ہے۔ بحیثیت قاری خود، انور زاہدی کے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں کھو سا جاتا ہے۔ قاری خود اس دور کو محسوس کر سکتا ہے۔ انور زاہدی کو آج بھی اپنے بچپن کے وہ دن بالکل اسی طرح یاد ہیں جس طرح کہ گویا وہ کل ہی کی بات ہوں، حالانکہ ان کو بیتے آدھی سے زیادہ صدی گزر چکی ہے۔ ڈاکٹر اے بی اشرف انور زاہدی کے ماضی کے مختلف احوال کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ان کی تمام کہانیوں میں خود اپنے حوالے، ترک کیے ہوئے شہروں کے حوالے، اپنے عزیزوں کے دوستوں کے حوالے، گلی کوچوں کے حوالے پہلے سے زیادہ تواتر کے ساتھ آئے ہیں۔''(۴۰)

یاد ماضی کے حوالے سے اہم اور اپنے بیتے بچپن کی یادوں سے مزین افسانوی مجموعہ '' بائسکوپ دن'' انور زاہدی کا سب سے آخری افسانوی مجموعہ ہے جو اب تک منظر عام پر آیا ہے۔ انور زاہدی کی زندگی کا بیشتر حصہ کڑی محنت اور خاصی مصروفیت میں گزرا۔ دوران ملازمت آپ کو ملک سے باہر، اپنی خدمات سرانجام دینے کا موقع بھی ملا۔ اب عمر کے اس حصے میں ماضی سے ربط اور گئے دنوں کی یاد ہی انور زاہدی کی زندگی کا حاصل ہے۔ '' بائسکوپ دن'' کا صیغہ واحد متکلم، رین بسیرا کا" میں "اصل میں یہی کردار انور زاہدی کی اپنی زندگی کی کہانی کے بنیادی کردار ہیں۔ جن پر آپ کی پوری زندگی کی کہانی انحصار کرتی ہے۔ آپ اپنے ماضی کی سہانی یادوں میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ اب بھی، آج کے ڈاکٹر انور زاہدی ہمیں ملتان کی ان گلیوں اور ماضی کے ان حویلیوں میں ملتے ہیں، جو اب کھنڈر بن چکی ہیں یا ڈھے چکی ہیں۔ جن کا وجود موجودہ نسل کے باسیوں کے نزدیک ذرا برابر اہمیت بھی نہیں رکھتا۔ بائسکوپ والے کے پیچھے، گلیوں کو لالٹین سے روشن کرنے والے کے پیچھے، مٹی کے تیل کی بوتلیں بیچنے والی صدا کو کھوجتے، رین بسیرا کی غلام گردشوں میں بھاگتے ہوئے یا پھر پرانے کاغذوں میں گم، اپنے کل کا اپنے آج سے موازنہ کرتے نظر آنے والے۔۔۔ وہ انور زاہدی ہی ہیں۔ آپ اپنے ماضی کو یاد کر کے راحت و اطمینان اور سکون قلب محسوس کرتے ہیں۔ اس کا اظہار وہ اپنے افسانے ''خواب سا دن'' میں ان الفاظ میں کرتے ہیں :

> ''تنگ گلیوں میں سے ہوتا ہوا، جب میں اس محلے میں پہنچا تو مجھے یوں لگا جیسے یا تو میں خواب دیکھ رہا ہوں یا پھر یہ جو بھی جگہ تھی، میری دیکھی بھالی ہی نہیں

میرے خیالوں میں کب سے آباد تھی۔۔۔یا خدا یہ کون سی جگہ ہے۔۔۔؟
اس قدر مانوس۔۔۔کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔۔۔؟"(۴۱)

ماضی کی یادیں انور زاہدی کا وہ بیش قیمتی اثاثہ ہیں، جس کو وہ عصر حاضر کے قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ان کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے کہ آپ کے چاروں افسانوی مجموعات میں کہیں نہ کہیں آپ کے ماضی کی بازگشت ضرور سنائی دیتی ہے۔ بچپن کے سنہرے دن ہوں، کالج میں گزرا ہوا زمانہ ہو یا پھر دوران ایم بی بی ایس کے تجربات ہوں۔ایران میں گزارا گیا وقت، سب انور زاہدی کے افسانوں کا لازمی حصہ ہیں۔

V۔ معاشرتی ناہمواری:

موجودہ دور کے افسانہ نگاروں نے جہاں دیگر موضوعات پر اپنا قلم اٹھایا، وہیں فرد کی محرومیوں اور اس معاشرے سے تعلق رکھنے والے افراد میں طبقاتی کشمکش بھی اہم موضوع کے طور پر سامنے آتی ہے۔ معاشرے کا مختلف طبقات میں بٹنا اور بالترتیب اعلی، متوسط اور غریب طبقے میں منقسم ہونا، اس معاشرے کا وطیرہ رہا ہے۔ معاشرے کی یہ تقسیم افراد میں معاشی و معاشرتی تفریق کو جنم دیتی ہے۔اس معاشرے کا یہ المیہ ہے جو جتنا مالی وسائل سے مالا مال ہوگا، زندگی کی تمام آسائشیں بھی اسی کو میسر ہوں گی اور جو معاشرے کا سب سے محنتی طبقہ ہے وہ اس سماج کا کمین کہلاتا ہے۔ یہ معاشرہ جن ہاتھوں سے پلتا بڑھتا ہے، وہ ہاتھ جو اس سماج کی حقیقی معنوں میں پرورش کرتے ہیں، اسی کے بڑوں کی طرف سے کچلے جاتے ہیں۔یہی یہاں کا دستور ہے۔اس تقسیم کے خلاف ہر دور میں آواز اٹھائی گئی، مگر اس حوالے سے کارل مارکس کا نام انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

" کارل مارکس نے مادی جدلیات کا نظریہ پیش کر کے مادے کو مرکزیت بخشی اور یوں یہ تصور سامنے آیا کہ سیاسی، تاریخی، معاشرتی اور اخلاقی سطح کی تمام تبدیلیاں، ذرائع پیداوار کی غیر مساوی تقسیم کے باعث معرض وجود میں آتی رہتی ہیں۔"(۴۲)

معاشرے کا غریب طبقہ اور عام آدمی ذہنی ناآسودگی کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ سماج اور معاشرے کو دلدل تصور کرتا ہے، جس معاشرے کی جکڑ بندیاں اسے مزید پستی میں دھنساتی جارہی ہیں۔ عصر حاضر کا انسان مایوسی اور خوف کا شکار ہے۔ معاشی بدحالی اور ذرائع معاش کی غیر منصفانہ تقسیم نے ہوس پرستی کو فروغ دیا۔ اس کیفیت میں انسان بھوکے بھیڑیوں کی مانند نظر آنے لگا۔ اس کی نظر عزت، دولت کی ہوس، سرمایے، معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لئے اپنے شکار پر جمی ہے۔ اس ساری صورتحال کی کریہہ اشکال آئے دن ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ اس ساری کیفیت کو انور زاہدی نے اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے اور صحیح معنوں میں موجودہ فرد کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ داخلی و خارجی سطح پر فرد کی یہی شکست و ریخت بطور موضوع انور زاہدی کا خاصہ ہے۔ اس حالت زار کو آپ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ہم سب نیچے، بہت نیچے پاتال کی گہرائیوں میں گرے چلے جارہے ہیں ۔اتھاہ گہرائیوں جن کی کوئی حد نہیں تھی۔ ہمارے قدم زمین پر ہونے کے باوجود بے سہارا تھے۔ ہمارے سروں پر موجود آسمان کی رنگت وہ نہیں جو ہماری پیدائش کے وقت تھی۔۔۔ آسمان گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا ہے۔۔۔''(۴۳)

معاشرتی طور پر یہ ابتری انسان کو گہری تاریک کھائی میں دھکیل چکی ہے، جہاں کی غلاظت اور گھٹن نے انسان کو بے بس اور ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے۔ عصر حاضر کا فرد آسودگی کی تلاش میں ہے مگر اسے ہر طرف بے چہرہ انسان دکھائی دے رہے ہیں۔ یہاں انور زاہدی معاشرے کو آسمان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ معاشرے کے رنگ ڈھنگ وہ پہلے سے نہیں رہے۔ آسمان مسلسل رنگ بدل رہا ہے۔ معاشرتی تقسیم اور معاشرے کے افراد کا مختلف طبقات کا پرچار کرنا، ہندوؤانہ طرز عمل کا عکاس ہے۔ ہندوؤں کا پاکستان چھوڑے کئی عشرے بیت گئے، ابھی تک ہمارے ہاں یہ ناسور اپنی پوری آب وتاب سے پنپتا رہا ہے۔ "بائسکوپ دن" کے افسانے "گلیوں میں گم" میں انور زاہدی نے ہندوانہ تقسیم کی طرف اشارہ کچھ اس انداز میں کیا ہے:

> ''کہاں ہوتے ہو آج کل۔۔ اور کیا کر رہے ہو۔۔۔؟ میں نے سوال کیا۔۔۔ میں آجکل مظفر گڑھ میں اسسٹنٹ کمشنر ہوں۔۔۔ اس نے ایک برہمن کی طرح کسی اچھوت سے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔۔۔ مجھے اس کے چہرے پر رعونت کے غازے میں سول سروس کی فرعونیت جھلکتی نظر آئی۔۔۔''(۴۴)

مصنف کے نزدیک اس معاشرے میں مختلف اسٹیٹس کی موجودگی، معاشرے کے دوہرے معیار زندگی کی وجہ بنتی ہے۔ معاشرے کا اعلیٰ اور متوسط طبقہ کس طرح اس معاشرے کے محنتی اور مزدور طبقے سے فرعونوں جیسا رویہ روا رکھتا ہے۔

معاشرے کا یہ طبقہ اپنے ماضی سے مکمل طور پر کٹ چکا ہے۔ ماضی سے آشنائی اور ماضی کی بازیافت اس طبقے کے لیے فضول کام، یعنی وقت کا ضیاع ہے۔

مصنف کے خیال میں یہ مڈل کلاس کے لوگ بھی عجیب مافوق الفطرت لوگ ہوتے ہیں۔ ساری عمر یہ اپنا سوشل اسٹیٹس درست کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ کلرک، سپریٹنڈوں، استادوں کی اولادیں، جو عام طور سے میڈیکل یا انجینئرنگ یا پھر فوج میں آفیسر کے امتحانوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے تو ایم۔اے کر کے سول سروس میں آجاتے ہیں۔ جب یہ سول سروس اکیڈمی میں چلے جاتے ہیں، تو وہاں کی تربیت سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے، تب یہ لوگ اپنے ماضی کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب یہ بڑے عہدوں والے لوگ کسی ماضی سے وابستہ انسان سے ملتے ہیں، تو اس قدر بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ دوبارہ ملنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''وہیں سول سروس کی تربیت کا شاخسانہ کریلے کو نیم چڑھا بنا دیتی ہے۔۔۔ جہاں دوران تربیت یہ باتیں اُن کو ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ سائل سے ہمیشہ دور رہو۔۔۔ بیشک وہ تمہارا باپ ہی کیوں نہ ہو۔''(۴۵)

سماج کو کھوکھلا کرنے والا گروہ کیڑوں کی مانند اسے کھائے جا رہا ہے۔ اس کی بنیادوں کو دیمک چاٹ چکی ہے:

> ''میرے دوست اس مرتبہ خزاں سے پہلے ہی کیڑے درختوں، فصلوں اور پھلوں کو غارت کر چکے ہیں۔ سنا ہے۔۔۔ یہ سب نفرت کی کھاد ڈالنے کا نتیجہ ہے۔ کیا تم نے شہر میں جگہ جگہ مایوسی کے پھیلے ہوئے جوہڑ نہیں دیکھے۔۔۔ جن کا پانی ہمارے کسی کام کا نہیں۔''(۴۶)

'' شہر بدر ہم زاد'' افسانے میں مصنف نے نفرت کی کھاد کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ آپ نے نفرت کی کھاد کو بنیادی طور پر تہذیبی و ثقافتی قدروں کے زوال کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان قدروں کے زوال کا

باعث عصر جدید کے وہ حالات ہیں، جنہوں نے انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے۔اس بنا پر انسانی رشتوں کی عما رت میں دراڑیں آ رہی ہیں۔اس افسانے میں " کریم" کا کردار اپنی نوعیت کا ایک الگ کردار ہے، جو پینٹر ہے۔ جسے دنیا کے حالات سے کوئی سروکار نہیں۔اس کی دنیا وہ چھوٹا سا علاقہ ہے جہاں کے گھروں میں وہ رنگ کرتا ہے۔افسانہ نگار نے اس کردار کی مدد سے انسان کی معاشی حیثیت اور تنہائی و غربت کے سبب ہونے والے والی وحشت کو احساس کے جذبے سے جوڑا ہے۔

یہ اجنبیت کا احساس یقیناً تنہائی اور غربت کی بدولت ہے۔ جس نے پورے گاؤں میں سے صرف اور صرف کریم ہی کو نہیں چنا بلکہ ہر شخص جو کہ اس معاشرے کے لئے کمی کی حیثیت رکھتا ہے،اس احساس محرومی کا شکار نظر آتا ہے۔

"عذاب شہر پناہ" افسانے میں انور زاہدی ایک تالاب کا ذکر کرتے ہیں جو کہ کیچڑ سے لبالب بھرا ہوا ہے، موسم کی شدت کی بدولت پانی سوکھنے کے قریب ہے۔ یہاں معاشرہ تالاب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ شدید موسم اور سخت دھوپ کو مارشل لاء میں پیدا ہونے والی سیاسی جبریت کی صورتحال کے طور پر بیان کیا گیا ہے ،اس معاشرے کی پیاس اور کیچڑ میں تڑپتی ہوئی مچھلیوں سے مراد اس معاشرے کے افراد ہیں جو کہ اس پر خوف فضا اور گھٹن زدہ ماحول میں جینے پر مجبور ہیں۔نہ کھل کے سانس لے سکتے ہیں،نہ ہی تالاب سے باہر نکل سکتے ہیں۔وہ زندہ تو ہیں پر ان کا شمار زندنوں میں ہر گز نہیں کیا جا سکتا:

یہاں فرد پناہ کی تلاش میں ہے۔اسے اپنا وجود شدید خطرے میں محسوس ہو رہا ہے۔ مگر جہاں اسے پناہ ملتی ہے وہ شہر اور اس کا عذاب فرد کے لیے مزید گھٹن کا باعث ہے۔ معاشرے کا فرد ذہنی مریض بن چکا ہے ۔مایوسی اور بے بسی نے اس کے تمام حربے ناکام کر دیے ہیں۔ وہ بستر مرگ پر پڑا سسک رہا ہے۔ وہ تنہا نہیں ہے جو اس کیفیت سے نالاں ہے۔ گویا اس گھٹن کا شکار مصنف اکیلا ہی نہیں تھا بلکہ ہر کوئی اس عذاب سے گزر رہا تھا۔

vi۔ ظلم، بے انصافی اور بے حسی:

ہمارے معاشرے کا مختلف طبقات میں منقسم ہونا، ہماری معاشرتی زندگی کی منہ بولتی تصاویر ہیں۔ معاشرے کا محروم طبقہ ،اعلیٰ طبقے کے ظلم و ستم سے ہمیشہ استحصال کا شکار رہا ہے۔ انور زاہدی نے معاشرے کے اس ناسور کی وجہ سے تشکیل پانے والے، ظلم، بے حسی اور بے انصافی پر محیط فضا کو اپنے موضوعات میں جگہ

دی ہے۔ متضاد رویوں اور سماجی طبقات میں منقسم، ہمارا معاشرہ دوہری ذہنیت کا شکار ہے۔ جھوٹا اسٹیٹس، منفی اور گھٹیا ذہنیتیں، احساس سے عاری معاشرہ تشکیل دیتی ہیں۔ یہاں پر موجود ہر شخص دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ جہاں جسے ذرا سے اختیارات ملے، وہیں اس نے اپنے سے نچلے طبقے پر مظالم کے پہاڑ توڑنا شروع کر دیے ۔احساس سے عاری معاشرہ ظلم و بربریت اور بے حسی کے فروغ کا باعث بن رہا ہے۔ آپ کے افسانوں کے پس منظر میں موجود یہ فکری تانے بانے انہی معاشرتی رجحانات اور فکری رویوں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ساری کیفیت اور اس معاشرے کی ذہنیت کی وجہ وہ سیاسی حالات رہے ہیں جو کہ عام آدمی کی زندگی میں رچ بس گئے ہیں۔

آپ کا افسانہ ''بے انجام کہانی'' اسی ظلم و بربریت اور ہمارے معاشرے کے ان رویوں پر سے پردہ اٹھاتی ہے، جو کہ معاشرے کے اعلیٰ طبقے نے غریب اور نادار طبقے سے روا رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے افراد جو کہ خود کو مسلمان کہلاتے پھرتے ہیں، مسلمان تو درکنار وہ انسان کہلانے کے بھی حق دار نہیں۔ جو انسانیت کے پرخچے اڑاتے اور اسے تار تار کرتے ہیں۔ مصنف نے ایک ایسے ہی واقعے کو افسانے ''بے انجام کہانی ''کا موضوع بنایا ہے۔ جس میں اس سفاک معاشرے کے چہرے سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ وہ معاشرہ جہاں بیٹیوں کو عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، وہیں انہیں سب کے سامنے برہنہ کیا گیا۔ اور جس علاقے کا ذکر کیا گیا وہاں پر موجود بے حس اجتماع میں سے کسی نے اس ظلم کے خلاف آواز تک نہ اٹھائی:

> '' پھر کسی کو سورج اور مسجد کا خیال ہی نہ رہا۔۔۔ ایسا لگتا تھا بستی کے بڑوں کا دماغ چل گیا تھا۔۔۔ علاقہ کونسل کے چیئرمین کے بیٹوں اور ان کے حواریوں نے بستی کے غریب گھر کی دیواریں ہلا دی تھیں۔۔۔ دروازے توڑ دیئے تھے اور اس بے بس گھر کی بہو بیٹیوں کو سرے بازار لا کر بے لباس کر دیا تھا۔۔۔''(۴۷)

وہی عزت جس کی حفاظت کے لیے محمد بن قاسم میلوں کا سفر کر کے سمندر پار سے آیا تھا۔ صرف ایک عورت کی پکار پر مسلمانوں نے یہاں کے راجہ داہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ مگر افسوس۔۔۔ آج اسی مسلم معاشرے میں عین مسجد کے سامنے عورتوں کو مادر زاد برہنہ کر دیا گیا تھا۔ ظلم ڈھانے والے اعلیٰ منصب پر فائز تھے جو نگہبان کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ جو علاقے کے کرتا دھرتا تھے، ان کی عورتیں چادروں میں لپٹی، مضبوط چار دیواریوں کی پناہ میں تھیں:

طبقاتی جبر اور سماجی بے انصافی ہر دور کا موضوع رہا ہے۔ یہ ازل سے یہاں کا وطیرہ رہا ہے مگر اسی اور نوے کی دھائی میں اردو افسانے نے ایک الگ ہی پہچان کروائی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد رقم طراز ہیں:

"اس دور میں جتنی بھی کہانی لکھی گئی اس کا موضوع کسی نہ کسی حوالے سے جبر و تشدد کا اظہار ہے۔ آزادی کے بعد خوابوں اور آدرشوں کو تعبیر نہ ملی۔ سماجی بے انصافی اور طبقاتی جبر کے ساتھ ساتھ بے توقیر سیاسی عمل نے آہستہ آہستہ پاکستانی معاشرے کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا۔۔۔"(۴۸)

ظلم، بے حسی اسی سیاسی نظام کی دین ہے۔ وہ طبقہ جسے مظلوموں کا سہارا بننے کے لیے چنا جاتا ہے، وہی ان مظلوموں کا جینا اجیرن کر دیتا ہے۔ وہی عوامی نمائندے جب حکومت کا حصہ بنتے ہیں تو بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ سانحات میں جاں بحق یا زخموں سے لڑتے ہوئے لوگوں کی عیادت کو جاتے ہیں تو بڑے دعوے کرتے ہیں، مالی امداد کی مد میں وہ ان لوگوں کی آواز چھین لیتے ہیں جو کہ ان کے خلاف اٹھنے کے پر تول رہی ہوتی ہے۔ اسی کیفیت کو انور زاہدی اپنے ایک افسانے "ماتم بال و پر" کا میں کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

"ٹی وی پر مستقل گمشدہ لوگوں اور ان معصوم بچوں کی تصاویر اور بچے نظر آتے ہیں، جو اپنے پیاروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ حکومت وقتی صورتحال سے فائدہ اٹھا کر امدادی کارروائیوں کی ڈھونڈی پیٹ رہی ہے۔ دھڑا دھڑ الوگوں کو بڑی بڑی رقوم کے چیک دینے کے وعدے کیے جا رہے ہیں۔ چیکوں کی وصولی کے لیے لمبی لمبی قطاریں ہیں۔ گویا ایک بار پھر شیطان نے مرکزی شہر میں شیرے کا ڈھیر لگا دیا ہے۔۔۔"(۴۹)

جس معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کی نظر میں اچھے یا برے کی کوئی تمیز تک باقی نہ رہے۔ انسان یہ سوچنے سمجھنے سے قاصر ہو کہ اپنی چار دیواری کے تقدس کو پامال کرتا پھرے۔ منشیات کا عادی اور جوئے کی لعنت میں مبتلا ایک کردار انور زاہدی کے افسانے "پس دیوار" میں بھی اپنی پوری سفاکی، ظلم و بربریت کے ساتھ، گھر کی زینت پر ظلم کے پہاڑ توڑتا نظر آتا ہے۔ شراب اور جوئے کے لیے وہ اپنی بیوی سے جسم فروشی کروانا چاہتا ہے تاکہ اس سے پیسوں کا حصول ممکن ہو سکے:

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔۔۔ جب قسمت نے میرے ساتھ یہ مذاق روا رکھا ہے تو میں اپنی قسمت سے نہیں لڑ سکتی۔۔۔ میرا شوہر ایک بدکار انسان ہے، جو سارا دن جوئے اور شراب میں وقت گزارتا ہے۔ رات گئے آتا ہے اور مجھ سے جسم فروشی کروانا چاہتا ہے۔۔۔ میں نے جب اس کی فرمائش کو رد کیا۔۔۔ تو اس نے مار مار کر میرا حشر کر دیا۔"(۵۰)

vii۔ سیاسی عدم استحکام:

انور زاہدی پاکستان کے بدلتے حالات، سیاسی انتشار اور مارشل لاء کے مختلف ادوار کے چشم دید گواہ ہیں ۔ پاکستان میں سیاسی ابتری اور سیاسی حالات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ ان سیاسی حالات و واقعات نے انور زاہدی کی فکر کو کافی متاثر کیا۔ اگر انور زاہدی کو فکر کا پس منظری مطالعہ کیا جائے تو ان کی سیاسی فکر باقی تمام موضوعات کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے کیونکہ سیاسی حالات ہی کسی ملک کی ترقی و تنزلی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہی حالات شخصی اور اجتماعی سطح پر افراد کی فکری تشکیل کا پیش خیمہ بنتے ہیں۔ اس کے ساتھ لوگوں کی زندگیوں پر براہ راست اثرات مرتب کرتے ہیں۔

اردو افسانے کی یہ خاصیت رہی ہے کہ اس نے ہر اس پہلو کی نشاندہی کی ہے، جو کہ معاشرے میں غلط روش کا باعث بنا ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں اردو افسانہ بطور مزاحمتی ادب کے سامنے آیا اور عام قاری کے سامنے مسائل کو پیش کیا جو کہ معاشرے کی گراوٹ کا باعث بن رہے تھے۔ ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء اپنی نوعیت کا سخت ترین مارشل لاء ثابت ہوا۔ شخصی آزادی اور ملک کے تمام اداروں کو مفلوج کر دیا گیا۔ آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ "عذاب شہر پناہ" پاکستان کے سیاسی حالات اور ان حالات کی بدولت عام آدمی پر مرتب ہونے والے اثرات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مزاحمتی ادب کے اس رویے کے بارے میں طاہرہ اقبال لکھتی ہیں:

"ادیبوں، شاعروں نے اس سیاسی گھٹن اور پامالی حقوق کے خلاف بہت لکھا۔ جسے "مزاحمتی ادب" کی اصطلاح کا نام دیا گیا۔ اگرچہ افسانہ اپنے آغاز کے ساتھ ہی ناانصافی، حق تلفی، ظلم و جبر، غیر جمہوری رویوں، آمریت، ریاستی جبر اور تشدد و وحشت کے خلاف لکھا جاتا رہا۔"(۵۱)

قیام پاکستان کے بعد بار بار حکومتوں کا بننا، ٹوٹنا، اقتدار کی جنگ، پے در پے مارشل لاء، جمہوریت پر آمریت کی چھاپ، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگیں، مختلف زمینی اور آسمانی آفتیں، فرقہ واریت، سقوط ڈھاکہ،

صوبوں کے مابین تعصب کی فضا، نان الیون کا واقعہ، امریکہ عراق جنگ کے اثرات اور دہشت گردی جیسے عوامل نے کبھی بھی پاکستان کو مستحکم نہیں ہونے دیا۔ پاکستانی عوام نے کبھی بھی ملکی حالات میں استحکام نہیں دیکھا۔ اسی بناپر انفرادی واجتماعی سطح پر پوری قوم ہی بے یقینی اور عدم شناخت جیسے مسائل کا شکار ہوئی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی جدید افسانہ نگاری کے رجحانات اور موضوعات کے تنوع کے بارے میں ہمارے معاشرے کے حالت زار اور ان تمام معاملات کی طرف ادباء کی توجہ مبذول کرواتے ہیں، جن حالات کا تعلق سیاست، معیشت، اخلاقی اقدار کے زوال، نفسا نفسی، متضاد رویئے، ظلم و بربریت سے ہے یا پھر ان تمام مسائل سے ہے جو کہ ایک عام انسان کو درپیش ہیں۔ ادباء کی توجہ ان مسائل کی طرف مبذول کرنا ضروری ہے۔ اسی تناظر میں ڈاکٹر جمیل جالبی "معاصر ادب" میں رقمطراز ہیں:

> "وہ معاشرہ جو رشوتوں پر پل رہا ہے، وہ عوام جو بے آواز ہے، وہ جاگیر دار اور سرمایہ دار جو عوام کو کھا رہے ہیں، سیاست کا سوانگ رچانے والے بے اخلاق لوگ جو نفرتوں کے گرم خون پر پل رہے ہیں اور نفرتوں کا زہر نئی نسلوں میں شامل کر رہے ہیں۔ وہ مفاد پرست، جو عوام کو بے شعور اور نابینا رکھنے میں مصروف ہیں۔ وہ صاحبان اختیار جو تاریخ کو نظر انداز کر کے صرف اپنے لئے زندہ ہیں۔ وہ مافیہ جو انسانی قدروں کا خونی ہے۔۔۔ یہ سب آپ کی کہانیوں کا منتظر ہے۔ اس عمل میں آپ نیا افسانہ پیدا کریں گے۔"(۵۲)

آمریت کے مختلف ادوار، سیاسی عدم استحکام کا باعث بنتے رہے۔ پاکستان کا یہ المیہ رہا ہے کہ موجودہ دور تک اس مملکت کو ایک بھی ایسا رہنما میسر نہیں آیا، جس نے پاکستان کے ہر مکتب فکر اور اداروں کو باہم یک جا کیا ہو۔ حکومت کے خلاف مظاہرے زور کا معمول بن چکے ہیں۔ اپوزیشن پارٹیاں، حکومتی پارٹیوں کو قدم جمانے کا موقع ہر گز نہیں دیتیں۔ جس کی وجہ آئے روز دنگا فساد، مظاہرے یا روڈ بلاک نظر آتے ہیں۔ یہ کیفیت یہاں کچھ اس طرح بیان ہوتی ہے:

> "شہر میں بلوہ ہو چکا ہے۔۔۔ بھگدڑ مچ گئی، لیکن کیوں؟ آپریٹر نے پھر پوچھا۔۔۔ پتہ نہیں کیوں لیکن پھر جس کا جدھر منہ اٹھا۔۔۔ اسی سمت بھاگ نکلا۔۔۔ کچھ سمجھ نہیں آیا، تبھی کہیں سے گولی چلنے کی آواز آئی۔۔۔ ہاں کوئی چیخا تھا۔۔۔ پولیس نے گولی چلادی ہے۔ لوگ بکھر گئے اور جو سامنے آگئے سڑک پر سے نہ اٹھ سکے۔

میری ٹانگ میں بھاگتے ہوئے نجانے کیا لگا کہ میں چکرا کر گر پڑا۔ پھر جان بچانے
کی خواہش نے مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا اور میں بھاگنے لگا۔ (۵۳)

یہ سارا منظر مظاہرے کے بعد کی صورت حال کو بیان کر رہا ہے۔ جہاں حکومت اپنی رٹ قائم کرنے کی کوشش میں سر گرداں نظر آتی ہے ۔

ج۔انور زاہدی کے افسانوں کا فکری مطالعہ :

آپ کے تمام افسانوی مجموعے اپنے عہد کے موضوعات ،مسائل ،فکری رجحانات کا احاطہ کرتے ہیں۔چاروں افسانوی مجموعے اپنے عہد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ادب کے جدید رجحانات اور اپنے ماضی کی دریافت پر مبنی یہ افسانے،عام قاری کے ذہن میں موجودہ صورتحال سے بغاوت کو پروان نہیں چڑھاتے بلکہ موجودہ صورتحال کا مقابلہ کرنے اور اپنے حال کو شاندار ماضی بنانے کی بھی ترغیب دلاتے ہیں کیونکہ آج کا حال، کل کا ماضی ہے۔

انور زاہدی کے ہاں زندگی کا شعور حقیقی معنوں میں ان کی تحریروں سے جھلکتا ہے۔زندگی کا شعور ہی اصل میں وہ روشنی ہے جو کہ معیاری ادب تخلیق کرنے کا باعث بنتی ہے۔اس کے ساتھ زندگی سے کشید کئے گئے تجربات، کثرت مطالعہ ،قدیم وجدید عہد میں تخلیق کیے جانے والے ادب پر گہری نظر اور اپنی تاریخ سے ربط ہی وہ عوامل ہیں جو کہ انور زاہدی کے عصری شعور کو تقویت بخشتے ہیں۔ وہ زندگی کی تفہیم کرنے میں کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔وہ اپنی شاندار تہذیبی و ثقافتی اقدار جو کہ معدوم ہو رہی ہیں ،انہیں تازگی فراہم کرتے ہیں۔آپ موجودہ صورتحال میں،اس معاشرے میں انہی اقدار کو کھوجتے نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی زندگی کے شعور سے متعلق بیان کرتے ہیں:

> ''یہ شعور زندگی سے گہرے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کے تجربات سے پروان چڑھتا ہے۔ علم و فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ضروری مطالعہ، موجودہ زندگی کی تفہیم ،تاریخ کے مطالعے، مختلف خیالات دنیا میں ایک مخصوص زمانے میں کیوں ابھرے اور پھیلے،اور کیوں اور کب مر گئے ؟اپنی تہذیب اور ثقافت کی تاریخ اور موجودہ صورتحال پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔۔۔اس شعور میں ماضی بھی شامل ہے اور حال بھی۔۔حال دراصل مستقبل کا ماضی ہے۔اس لیے ہر لکھنے

والے کو "حال" کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے۔اسے قبول بھی کرنا چاہیے اور رد بھی۔"(۵۴)

آپ کے پہلے دونوں افسانوی مجموعے عصری سیاسی صورتحال کو سامنے لاتے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''عذاب شہر پناہ'' میں بیشتر افسانے جبر کی کیفیت، معاشرے کی گھٹن، فرد کی شناخت، عدم تحفظ جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ دوسرا افسانوی مجموعہ ''موسم جنگ کا کہانی محبت کی'' ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ پاکستان کی جنگی صورتحال، امریکہ عراق کشیدگی، عالمی منظر نامے اور تیسری دنیا کے انسان میں بے یقینی اور زندگی کی بے ثباتی جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ اکیسویں صدی میں شائع ہونے والے دونوں افسانوی مجموعے بالترتیب '' مندر والی گلی'' ۲۰۰۳ء میں اور ''بائسکوپ دن'' ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آئے۔ان مجموعوں میں انور زاہدی نے اپنی زندگی کے مختلف تجربات، بیرونی ممالک کے اسفار کا احوال اور سب سے بڑھ کر اپنی مرضی کا احوال بیان کیا ہے۔ اپنے بچپن، لڑکپن جوانی کے مختلف واقعات اور ماضی پرستی ان مجموعات میں خاصی اہمیت کے حامل فکری زاویے ہیں۔

جوانی اور ملازمت کے دوران نقل مکانی کے تجربات، زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے اہم واقعات کو کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں انور زاہدی اپنے ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہیں ۔ فلش بیک تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے اچانک اپنے حال سے ماضی میں پہنچ جاتے ہیں۔ کبھی وہ اپنی جنم بھومی شہر ملتان، جہاں آپ کا بچپن گزرا، ان گلیوں میں بائسکوپ دن میں بارہ من کی دھوبن دیکھنے میں مشغول ہیں، تو کبھی لالٹینیں روشن کرنے والے کی تلاش میں گم ہیں۔ وہ اپنے ماضی کی یادوں میں سکون محسوس کرتے ہیں۔ عصری حالات و واقعات سے توجہ بٹانے اور زندگی کی طرف لوٹنے میں ان کا ماضی پیش پیش نظر آتا ہے۔

i۔ماضی پرستی:

انور زاہدی جدید افسانہ نگاروں میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ کہانی کہنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ انسانی جذبات واحساسات کو اس احسن طریقے سے قاری کے سامنے رکھتے ہیں، جس سے کہانی کا تاثر مزید نمایاں ہو جاتا ہے۔ انور زاہدی کے افسانوں کے موضوعات کا خمیر اس معاشرے سے وابستہ عام آدمی کی زندگی سے لیا گیا ہے۔ ماضی پرستی، اور ماضی کی بازیافت انور زاہدی کے افسانوں میں لاشعوری سطح پر اس لیے در آتی ہے کہ آپ آج بھی اپنے ماضی کو ساتھ لئے چل رہے ہیں۔

سائنس نے زندگی کے ہر میدان میں جو ترقی کی ہے وہ قابل قدر ہے۔ آپ اس امر کی بھی تائید کرتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ جو منفی رجحانات اور رویے اس معاشرے کو میسر آئے ہیں، آپ ان کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کی تردید کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ انور زاہدی کے یہاں ماضی سے محبت، اپنی ثقافت، ثقافتی اقدار سے سے لگاؤٹ کا اظہار واضح طور پر دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ماضی کے شب و روز، عمر کے مختلف ادوار نے جہاں ان کے تجربات میں اضافہ کیا وہیں اپنی تہذیب و تمدن اور انسانی زندگی کے مختلف رویوں کو بھی ان پر آشکارا کیا۔ آپ اس سماج، اس معاشرے سے بخوبی آگاہ ہیں۔ عہد جدید نے کس طرح اس معاشرے میں عدم تحفظ، عدم شناخت، مایوسی، مادیت پرستی جیسے منفی رویوں کو جنم دیا۔ آپ ان عوامل کی نشاندہی کرتے ہیں، جنہوں نے انسان کو انسان سے متنفر کر دیا، جس نے انسانیت کو تار تار کر دیا۔ احساس اور ایثار کے جذبے کا قلع قمع کر دیا۔ آپ کے افسانوں کے کردار، یہاں کی ثقافت اور ان ثقافتی اقدار کے نگہبان نظر آتے ہیں، جواب محدوم ہونے کے قریب ہیں۔

" بائسکوپ دن "، "رین بسیرا"، " طائر شب " ، "پرانے کاغذوں میں "، "ٹوٹا ہوا ٹرک "ہو یا "مندر والی گلی"، "بکائین کی کہانی" ہو یا" پرسے کی گرد میں اٹا سفر " ہو، سب افسانوں میں کہیں نہ کہیں انور زاہدی اپنی مرضی میں جھانکتے ضرور نظر آتے ہیں۔ بچپن کی یادوں کا احوال انور زاہدی نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہمارا کل ہمارے آج سے بہت بہتر تھا۔ اپنے شہر ملتان کا ذکر آپ ان الفاظ میں کرتے ہیں، جہاں آپ کے بچپن اور جوانی کے ایام بسر ہوئے:

> ''میں نے اسے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے مری کی پر فضا سے اٹھا کر اس گرم شہر میں پہنچا دیا تھا۔۔۔ جہاں سارا سال ایک سا موسم رہتا تھا۔۔۔ ایک آندھی، جو گرمیوں میں چلنا شروع ہوتی تھی، اور وہ رات بھر چلے جاتی تھی ۔۔۔ جس کا زور سردیوں میں ذرا کم ہو جاتا تھا۔ لیکن جس شہر میں بچپن اور جوانی کے دن گزرے ہوں، بچپن کے یار دوستوں کی منڈلی سجی ہو، وہاں آندھی چلے یا آگ برسے۔۔۔ اسے یاد کی نہاں خانوں سے بھلا کیسے بھلایا جاسکتا ہے۔''(۵۵)

یہاں انور زاہدی نے آندھی اور آگ کو بطور استعارہ استعمال کرتے ہوئے موجودہ دور پر طنز کیا ہے کہ انسان جس قدر عصر حاضر کی آندھی کی لپیٹ میں ہو اور جس قدر اسے، اس زمانے کی تپش نے جھلسا دیا ہو، مگر

گزارے ہوئے بچپن کی یادوں کی جڑیں کہیں نہ کہیں سے پھوٹ پڑتی ہیں۔اس بنجر زمانے میں اگر دل سوکھ بھی جائیں تو یہ یادیں انھیں بنجر ہونے سے بچائے رکھتی ہیں۔آپ کی یہی فکر افسانوی مجموعے ''مندر والی گلی'' کے ایک افسانے'' بارش کا شور'' میں سامنے آتی ہے۔جس افسانے کا مرکزی کردار ایک معمر خاتون "حسینہ بوا" ہیں جو کہ پر سرار اور بارعب شخصیت کی مالک ہیں۔انور زاہدی کا یہ مرکزی کردار بھی ماضی کی دریافت میں مصروف عمل ہے۔اس امر کی وضاحت "بارش کے شور" افسانے کے ایک اقتباس سے کی جاسکتی ہے:

> ''حسینہ بوا کیا ڈھونڈ رہی ہیں۔۔۔؟اور وہ اداس آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ آہستگی سے بولی تھیں'' گزرے دنوں کی کھوج کر رہی ہوں۔''(۵۶)

حسینہ بوا کی طرح انور زاہدی بھی اپنے ماضی کی کھوج میں سر گرداں ہیں۔"غائب از نظر" افسانہ بھی اس حوالے سے خاصی اہمیت کا حامل افسانہ ہے۔اس افسانے کا "واحد متکلم "اپنی ماضی کی کھوج میں اپنے پرانے شہر، محلے کو کھوجتا پھرتا نظر آتا ہے۔جہاں کے باسی اسے برسوں بعد پہچاننے سے قاصر ہیں۔جن کے ساتھ وہ پلا بڑھا،اب ان سے آشنائی ناممکنات میں سے ایک ناممکن بات ہے۔اپنے ماضی سے وابستہ کرداروں کو یہاں مصنف نے کمال مہارت سے اس کہانی میں پرو دیا ہے،اس افسانے میں اچانک خواب، حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے۔

وہ بچپن میں چڑیاں پکڑنا،انہیں رنگنا اور پھر آزاد کرنا، یہاں قاری کا چند ساعتوں میں اپنے بچپن میں پہنچ جانا،یقیناً ایک فطری عمل ہے۔اس افسانے میں جس طرح کی مصنف نے بچپن کے حوالے سے منظر کشی کی ہے،اپنی مثال آپ ہے۔انور زاہدی زبان و بیان پر دسترس رکھتے ہیں اور یہی عمل قاری کے دل میں ایک تاثر پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے:

> ''میں چڑیا کو رنگتا اور دانا پانی کھلا کر آزاد کر دیتا۔۔۔ پھر آنے والے دنوں میں زرد رنگ کی چڑیا کو اڑتی ہوئی دوسری چڑیوں میں ڈھونڈا کرتا۔۔۔ کبھی اتفاق سے نظر آ جاتی ہے اور کبھی مدتوں آنکھیں اسے کھوجتی رہتیں۔۔۔ برسوں بعد ۔۔۔ موکھلے میں بیٹھی ہوئی ایک چڑیا مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔۔۔ کہیں یہ وہی چڑیا تو نہیں۔۔۔''(۵۷)

موجودہ دور میں آج کل کے بچے بھلا کہاں چڑیاں پکڑتے اور بائیسکوپ دیکھتے ہیں۔ وہ تو بس لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ اور موبائل فون پر ہماوقت گیمز یا سوشل میڈیا پر آن لائن نظر آتے ہیں۔ اس سائنسی ترقی نے مصنف کے نزدیک عصر حاضر کے بچوں سے ان کا بچپنا چھین لیا ہے۔ آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آج کے والدین نے اپنے بچوں کو کھو دیا ہے۔ اس سوشل میڈیا کی یلغار نے گھر کے بنیادی رشتوں میں دراڑیں ڈال دی ہیں۔ ایک گھر کے مکین دوسرے سیارے کی مخلوق معلوم ہوتے ہیں۔ جب یہی دوری گھروں سے باہر نکلی تو تہذیبی اقدار مسخ ہونے لگیں۔ سوشل میڈیا کے ذریعے دنیا گلوبل ویلیج تو بن گئی ہے، مگر اپنے، اپنوں سے کوسوں دور ہو گئے۔ آپ دنیا کے کسی کونے میں موجود کسی انسان سے بات کر سکتے ہیں، اسے دیکھ سکتے ہیں، مگر کیا ایک گھر کے افراد کو یہ قربت نصیب ہوتی ہے؟ اب والدین اور بچوں کا ایک میز پر بیٹھنا دشوار ہو گیا ہے۔ ''ڈاؤن میموری لین'' افسانے میں انور زاہدی باپ بیٹی کی محبت کو بیان کرتے ہیں۔ بیٹیاں کہیں بھی ہوں انہیں ہمیشہ اپنے والدین کی فکر رہتی ہے۔ اس افسانے میں مختلف میسیجز کے ذریعے باپ بیٹی کے مابین مکالمے کو پیش کیا گیا ہے۔

ماضی کا حوالہ انور زاہدی کے ہاں کئی طرح سے وقوع پذیر ہے۔ ایک طرف تو آپ اپنے بچپن کے قصے کہانیاں سناتے ہیں، دوسری طرف ان خوشیوں اور پر لطف زمانوں کا ذکر کرتے ہوئے جن سے عصر حاضر کی نسل محروم ہو چکی ہے۔ جنہیں محض آج کے دور میں ایک خواب تو تصور کیا جا سکتا ہے حقیقت تسلیم کرنا مشکل ہے۔

بیتے دنوں میں بچوں میں شعور اس قدر نہیں تھا کہ وہ نامعلوم سے معلوم تک کا سفر طے کر سکیں۔ ایسے ذرائع ناپید تھے۔ سہولیات کمیاب تھیں۔ بہت سے سوالات اور انہیں جاننے کی جستجو بڑوں کی ڈانٹ سے دب جایا کرتی تھی۔ مگر موجودہ دور میں کوئی بھید، بھید نہیں رہا۔ اپنے آخری افسانوی مجموعے میں آپ ماضی اور حال کا تقابل ان الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں:

> ''آج کے عہد کے بچوں کے لئے اس سارے ڈرامے میں کوئی بات ہی موجود نہیں۔۔۔ جو ہمارے بچپن کے دنوں میں اس بائسکوپ والے کے آنے سے ہم لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی تھیں۔۔۔ یار وہ تمہیں بائیسکوپ والا یاد ہے۔۔۔؟ جی بڑے بھیا۔۔۔ اچھی طرح یاد ہے بھائی بائسکوپ والا۔ کیوں کیا ہوا۔۔۔؟ کچھ دن پہلے مجھے ملا تھا۔۔۔ اندھا ہو گیا ہے بیچارا۔۔۔ بھیک مانگ رہا تھا۔۔۔ کہنے لگا بھیا

---زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے--- اب کون بچہ بائسکوپ دیکھے گا---؟ سینما تو گھر گھر میں آ گیا ہے---''(۵۸)

''ٹوٹا ہوا ٹرک'' بھی انور زاہدی کا شاندار افسانہ ہے، جس میں ماضی کی یادوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ پورا افسانہ ٹوٹے ہوئے ٹرک کی گرد گھومتا ہے۔ بچپن کی یادیں ماضی کے صبح و شام، اس ٹوٹے ہوئے ٹرک میں گزارا گیا وہ وقت، سب اس کہانی کا حصہ ہیں۔ یہ بیش قیمتی اثاثہ مصنف کا سب کچھ ہے:

''جب تک اسکول کے دن ختم نہ ہوئے یا بچپن کے دن جوانی کی گرما گرمی میں گم ہو گئے، ٹوٹا ہوا ٹرک بچپن میں گزرتے ہوئے دنوں کے لئے ایک تھرل، ایک کھیل، ایک پناہ گاہ کا کام دیتا رہا۔''(۵۹)

افسانوی مجموعے ''موسم جنگ کا کہانی محبت کی'' کا افسانہ ''پرسے کی گرد میں اٹا سفر'' بھی مصنف کی یادوں کا احوال بیان کرتا ہے۔ اس افسانے میں مصنف ایک پرسے کا احوال قلم بند کرتا ہے۔ اس خوبصورت افسانے میں مصنف بہاولپور میں اپنے ننھیال کا احوال سناتے ہیں اور اپنے حال سے ماضی میں جا پہنچتے ہیں۔ جہاں پر کوئی شخص مٹی کے تیل کی بوتلیں فروخت کرتا سنائی دیتا ہے۔ ماضی کی وہ ویران گلیاں، بے شک لالٹینوں سے ضرور روشن ہوتی تھیں مگر ان گلیوں میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ موجودہ صورتحال اور اس نفسا نفسی کے عالم میں سٹریٹ لائٹس کی دمکتی روشنیوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ انسان، انسان سے خائف ہے۔ بے جا ضرورتوں نے جائز و ناجائز تمام راستے منچلوں اور جرائم پیشہ افراد کے لیے کھول دیے ہیں۔ وہ ان روشن گلیوں میں دندناتے پھرتے ہیں، کسی کی عزت نہیں محفوظ، کوئی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ مصنف کے نزدیک انگلیوں سے وہ گلیاں کتنی محفوظ اور خطروں سے بے نیاز تھیں:

''پورے شہر کے چند بازاروں میں بس بڑی بڑی دکانوں پر ہی بلب نظر آتے۔ لالٹینوں اور لیمپوں سے دوکانیں اور گھر روشن رہتے۔ تندوروں اور معمولی حیثیت کی دکانوں پر ٹین کی کپی جلا کرتی۔ لیکن پھر بھی گلیوں میں آسیبی اندھیرے کے باوجود خوف کا بسیرا نہ تھا۔''(۶۰)

فطری طور پر وقت ایسا مرہم ہے جو گہرے سے گہرے زخموں کو بھی بھر دیتا ہے۔ جسم پر لگے گھاؤ تو بھر جاتے ہیں مگر روح پر لگے زخم تب تازہ ہوتے ہیں جب بھی ان زخموں کو کھریدا جائے۔ ماضی قریب اور

ماضی بعید میں وقوع پذیر ہونے والے سانحات جب کسی اور رنگ اور نئے کرداروں کے ساتھ سامنے آتے ہیں، تو پرانے زخم تازہ ہو جاتے ہیں، پھر ان سے لہو رسنا شروع ہو جاتا ہے۔

انور زاہدی بھی اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔ عصر حاضر کے واقعات، جنگ و جدل، انسان کا انسان پر بہیمانہ تشدد، نئے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ منہدم تہذیبیں، عالیشان ماضی کی تباہ حال صورت پھر سے نظروں کے سامنے تیرنے لگتی ہے۔

ii۔ معاشی استحصال و عدم تحفظ:

انور زاہدی نے اس معاشرے کے مسائل کو اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدے کے ذریعے نہ صرف محسوس کیا، بلکہ ان مسائل کو اپنے افسانوں میں مختلف کرداروں یا صیغہ واحد متکلم کے ذریعے بیان کیا ہے۔ معاشرے سے وابستہ افراد کو معاشی اور معاشرتی سطح پر درپیش یہ مسائل جہاں اس کی زندگی کو نعمت کی بجائے زحمت بناتے ہیں وہیں مایوسی، فرسٹریشن اور عدم تحفظ کو جنم دیتے ہیں۔

انور زاہدی معاشی استحصال کو خشک سالی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس طرح خشک سالی زرخیز سے زرخیز زمین کو بھی بنجر اور بانجھ بنا دیتی ہے، اسی طرح ضرورتوں کا کم آمدنی کے ذریعے محرومی کا شکار رہنا بھی زندگی سے رمق چھین لیتا ہے۔ مصنف کا افسانہ ''خشک سالی'' بھی اسی موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ ملکی حالات، روزگار کے کم مواقع، مہنگائی یہ سب وہ عوامل ہیں جو اس معاشرے کو کھوکھلا اور کمزور کر رہے ہیں۔ ہر طرف کڑی دھوپ ہے، کہیں کوئی امید، کوئی سایہ نظر نہیں آتا۔ جس کے سائے میں بیٹھ کر انسان فرحت و راحت محسوس کر سکے۔ آپ اس معاشرے کی نوخیز نسل کو درختوں پر لگنے والے بور سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جنہوں نے مستقبل میں درختوں کے پھول اور پھل بننا ہے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ یہ بور خشک سالی کی بدولت یونہی درختوں سے غائب ہو جائے گا۔ جیسے کہیں اس کا وجود تک نہ تھا۔ یہی کیفیت افسانہ 'خشک سالی" میں یوں بیان کی گئی ہے:

> ''اس بار کی کڑی دھوپ نے سارا بور جلا دیا تھا۔ درختوں تلے کی زمین سوکھ کر پتھر ہو گئی تھی۔ روشوں کے کنارے گھاس کی جگہ خشک مٹی اڑ رہی تھی۔ اس کی متلاشی نگاہیں ایک بار پھر آسمان پر کچھ ڈھونڈنے لگیں، لیکن نیلے کنچ آسمان پر دور دور تک کہیں بادل کا نام و نشان نہ تھا۔''(۶۱)

شہر کے کسی بڑے چوک کا چکر لگایا جائے تو ایک سے ایک خوبصورت پڑھے لکھے نوجوان مختلف اوزاروں سے لیس، مزدوری کی تلاش میں کھڑے نظر آتے ہیں، کہ کوئی شخص آئے اور ہمیں کام کے لیے لے جاسکے۔ اپنے اور گھر والوں کے پیٹ کی آگ بجھائی جاسکے۔ غم روزگارہ میں مبتلا عصر حاضر کا نوجوان اپنی زندگی سے بیزار اور اپنے ہی گھر میں گھٹن اور عدم تحفظ کا شکار ہے۔ مصنف اس گھٹن زدہ زندگی کو کسی تنگ و تاریک سرنگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک ایسی سرنگ جو نا مختتم ہے، اس سرنگ کا دوسرا حصہ کوئی نہیں جانتا، جہاں سے تازہ ہوا یا زندگی کو جلا دینے والی روشنی کی صوتے پھوٹتے ہیں، کہیں گم ہے۔ معیشت کی اس چکی میں افراد پستے جارہے ہیں۔ جس نے عمر کا لحاظ تو درکنار جنس تک کو نہیں بخشا۔ "عذاب شہر پناہ" میں شامل افسانہ " سرنگ "بنیادی طور پر ان تجربات اور مشاہدات کا حامل افسانہ ہے، جس میں انور زاہدی نے اس سسٹم کا ایک تاریک سرنگ سے موازنہ کیا ہے، جو کہ سب کچھ نگلنے کے درپے ہے:

> " ہمارے گھروں کو بھی سرنگ نے نگل لیا اور ان میں موجود لوگ وہ خوبرو جوان، حسین و جمیل نازک اندام لڑکیاں، نومولود بچے۔۔۔ وہ سب آخر کہاں چلے گئے۔۔۔؟ کہا تو ہے ان سب کو سرنگ نگل گئی۔۔۔ یعنی وہ سب مر گئے۔۔۔ نہیں نہیں سرنگ کو مارنے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ تو بس نگل لیتی ہے، ہم سب ، ہمارے گھر بار، ہماری زمینیں، کھیتیاں، باغات سب کچھ خزاں کے موسم سے پہلے ہی سرنگ کے پیٹ میں چلے گئے اور اب تو سنا ہے کہ خزاں بھی سرنگ کی طرف آتے ہوئے ڈرتی ہے۔۔۔"(۶۲)

آج کے نوجوان کے لیے پروفیشن کا چناؤ ایک بہت مشکل امر ہے۔ والدین اور خاندان کی طرف سے جب کوئی پیشہ زبردستی جب کسی طالب علم پر مسلط کیا جاتا ہے، تو وہ محض اسے ڈگری کے حصول کے لیے تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اس میں پیشے سے لگن کی بجائے نفرت اور بیزاری کے جذبے کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ وہ خود کو ایک زندہ لاش تصور کرنے لگتا ہے اور عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے۔ "آگہی اور دوسرا آدمی میں" مصنف نے ایک ایسے ہی نوجوان طالب علم کے احساسات کی ترجمانی کی ہے، جس کو اپنے روزگار کی فکر تو ہے مگر ساتھ ساتھ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں بھی عدم تحفظ کا شکار ہے:

> "لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس نے ایسا کبھی نہ سوچا تھا۔ اس کے انجینئر بننے کے بارے میں خود اس کے علاوہ بہت سے دوسرے ایسے تھے جو مستقل سوچ

رہے تھے۔اصل مسئلہ توڈگری کا تھا،اس کے مستقبل کا نہیں۔۔۔ڈگری باقی تمام مسائل سے زیادہ وزن رکھتی تھی جسے پالینے کے بعد وہ باقی تمام دوسروں کی طرح ہست و بود کے فلسفے میں الجھ جائے گا۔لاز اور ان لاز کے چکر میں گرفتار ہو جائے گا۔"(۶۳)

یہاں عدم تحفظ کی فضااور مستقبل کی فکر یکساں دیکھی جاسکتی ہے۔اس میں افراد کا مختلف گروہوں میں منقسم ہونا، زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرتا ہے۔ یہ تقسیم اس معاشرے کے نادار طبقے کو غربت و افلاس کے اندھیروں میں دھکیلنے کا باعث بنتی ہے۔ موجودہ دور میں امیر، امیر تر ہوتا جارہا ہے اور غریب دو وقت کی روٹی کے لیے ترستا رہا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ ہمیشہ اس ٹوہ میں ہے کہاں سے اور کیسے دوسرے طبقات کا استحصال کیا جا سکے۔

مصنف چونکہ طب کے شعبے سے وابستہ رہے، ہسپتال سے ان کا واسطہ ہمیشہ سے رہا ہے۔یہی معاشی تقسیم کی کیفیت عصر حاضر کے ہسپتالوں میں بھی مختلف طبقات میں برتی جاتی ہے۔اس تقسیم کی بدولت جیسا اسٹیٹس، ویسا علاج۔۔۔یہی المیہ افسانے "مندر والی گلی" میں کچھ اس انداز میں بیان ہوا ہے:

"یہاں ذکر ان پوش قسم کے ہسپتالوں کا نہیں ہو رہا کہ وہاں عوام تو جا ہی نہیں سکتے۔لہذا مسائل کیسے پیدا ہوں گے۔ویسے بھی اس قسم کے ہسپتالوں میں بعض کا یومیہ کرایہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل سے کم نہیں ہوتا۔۔۔وہاں پہنچنے والے مریض اول تو کیٹیگری کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔"(۶۴)

مصنف کے نزدیک تعصب کی فضا بھی اس سماج کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ یہ تعصب، مذہبی سطح پر ہو یا علاقائی سطح پر عام انسان کی زندگی کو کافی حد تک متاثر کرتا ہے۔طبقات کی یہ تقسیم ہی وہ بنیادی محرک ہے جو کہ تعصب کی فضا کو فروغ دیتا ہے۔شہروں میں بسنے والی عوام کو دیہات میں بسنے والی عوام کی نسبت روزگار کے زیادہ مواقع میسر آتے ہیں۔ وہ معاشی طور پر مستحکم ہوتے ہیں اس لیے اس کے برعکس گاؤں سے تعلق رکھنے والے غریب اور سادہ لوح دیہاتی اپنی گزر بسر کھیتی باڑی پر ہی کرتے ہیں۔انور زاہدی کا ایک کردار "نذر علی" کے نام سے موسوم ہے۔افسانے "بکائین کی کہانی" کا بنیادی کردار ہے۔اس کردار کی وساطت سے مصنف اس معاشی استحصال اور طبقاتی کشمکش کو یوں بیان کرتے ہیں:

''دراصل ہم شہر کے رہنے والے ایک ایسے نفسیاتی عارضے کا شکار ہو جاتے ہیں، کہ ہم خود کو تو مسٹر نوآل سمجھتے ہیں اور شہر کے نسبتاً سستے علاقوں میں بسنے والوں کو ڈاؤن ٹاؤن والے کہہ کر حقیر گردانتے ہیں اور شہر کے باہر مضافات یا دور افتادہ دیہاتوں کے باسیوں کو انسان ہی نہیں گردانتے۔۔۔ محض اس لیے کہ وہ شہری سہولتوں سے محروم ہوتے ہیں۔۔۔ یعنی ہماری دانست میں اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ وہ ہم سے، ہمارے انداز میں بات کر سکیں۔''(۶۵)

مصنف نے مختلف استعارات اور علامات کا سہارا لیتے ہوئے انسان کی داخلی اور خارجی کیفیت کے مختلف زاویوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مصنف کا واحد متکلم بظاہر خود سے مخاطب ہو کر بات کرتا ہے مگر اس کا اشارہ سماج کی طرف ہوتا ہے۔

معاشرے کا فرد اس سارے نظام کو ٹھکراتا ہوا نظر آتا ہے۔ ماضی میں کی جانے والی غلطیاں ہر گز دہرانا نہیں چاہتا۔ وہ ایک ایسے پر سکون معاشرے کا خواب دیکھتا ہے جو کہ حقیقی معنوں میں ایک مثالی معاشرہ ہو۔ جہاں انسانوں کے حقوق مساوی اور عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ جہاں معاشرہ طبقات میں تقسیم ہونے کی بجائے اعلی طبقے یا نادار طبقے کی تفریق نہ کر سکے۔ کوئی ایسا سرمایہ دارانہ نظام نہ ہو، جہاں سب برابر ہوں۔ سب کو اچھی اور بہترین زندگی گزارنے کا حق حاصل ہو۔

iii۔ موت بطور موضوع: (زندگی کا عارضی پن۔۔۔ فکر موت)

انور زاہدی کے افسانوں میں موت بطور موضوع، اپنی انفرادیت کے حوالے سے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کے پہلے افسانوی مجموعے ''عذاب شہر پناہ'' کے علاوہ ''موسم جنگ کا، کہانی محبت کی'' کے اکثر افسانوں میں آپ کے تخلیق کردہ بنیادی کردار کسی نہ کسی صورت میں موت سے دوچار نظر آتے ہیں۔ اسی ضمن میں انور زاہدی خود رقمطراز ہیں:

''کچھ ایسے ہی موت کا ذکر بھی اپنی تمام تر ناخوش گواریت کے باوجود چاہے ہم اسے کتنا ہی نظر انداز کرنے کی شعوری کوشش کرتے رہیں۔۔۔ راستے کے سنگ میل کی طرح، ایک اٹل حقیقت کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ موسم بہار کی رنگینیاں جو زندگی کی علامت ہیں، اس میں شک نہیں کہ فضا میں چار سو رنگ بکھیر دیتی ہیں

۔۔۔لیکن تابہ کہ۔۔۔خزاں کا ظالم ہاتھ ایک ہی وار میں سب کچھ ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ یہاں بہار اور خزاں زندگی کے عروج و زوال کے دو رخ ہیں۔ گویا جب، موت کا ذکر ہوتا ہے ہم دراصل زندگی کی کہانی کو دہرا رہے ہوتے ہیں۔ ''(۶۶)

مصنف جہاں زندگی اور انسانی احساسات و جذبات کی بات کرتے ہیں، وہیں موت یعنی زندگی کی بے ثباتی کو مختلف انداز میں اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہیں۔ آپ کے نزدیک موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ جہاں کہیں زندگی موجود ہے، وہیں موت کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ آپ کے افسانوں میں موت، زندگی کے ہمراہ نظر آتی ہے۔ انہونی کا خوف ہمیشہ زندگی کو جکڑے ہوئے ہے۔ آپ کے اسی تصورِ زندگی کے بارے میں ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

''اچھی کہانی تو اس وقت شروع ہوتی ہے، جب ایک طبیعاتی وجود اور حرکت کو کسی ما بعد الطبیعاتی پراسراریت سے ملا دیا جائے۔ وہاں کے سائے، پرچھائیاں، آوازیں، رنگ و بے رنگی اور قریب و بعد طبیعاتی ٹھوس پنے میں ملائمت بھرتے ہیں اور موت زندگی کے قریب قریب رہ کر اسے دیکھتی اور مسکراتی ہے، تو اس دلآویز تبسم میں کہانی کا داخلی رومانس تخلیق ہوتا چلا جاتا ہے۔''(۶۷)

انسان کے تمام معاملات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، جب موت زندگی کو شکست دیتی ہے۔ مستقبل کے حوالے سے بنائے گئے منصوبے، سب خاک میں مل جاتے ہیں۔ یہی کیفیت مصنف کے افسانے ''فالٹ لائن'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ افسانہ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو پیش آنے والے شدید زلزلے کے تناظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں موت کے حوالے سے مصنف کی فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔ مذکورہ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''کیسی عجیب بات ہے؟ جب کہ اس کارگاہِ حیات میں زندگی ہے کہ ہر دم رواں دواں ہے۔ بے شمار سکندر آئے۔۔۔کئی چنگیز اور ہلاکو اپنی وحشت اور غیظ و غضب کے باعث آج بھی بلاشبہ تاریخ کے ایوانوں میں نظر آجاتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی ہو گا کہ کسی کے جانے سے اس کارگاہِ حیات کا کام رک جائے۔ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔۔۔ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔''(۶۸)

افسانہ ''رین بسیرا'' بھی فکری حوالے سے زندگی کی بے ثباتی پر اہم افسانہ ہے۔ جس میں کہانی کا مرکزی کردار "مظفر" زندگی اور موت کے درمیان معلق نظر آتا ہے۔ مظفر نامی افسانے کا یہ مرکزی کردار اپنے طور اطوار سے ہر کسی کی آنکھوں کا تارا ہے، جس سے بچھڑنے کے بارے میں کوئی تصور تک نہیں کر سکتا۔اس کی یوں اچانک موت سب کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ بنتی ہے۔ مظفر بھائی کی موت کا احوال مصنف کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

''ایک دن صبح ہی نزہت کے فون سے مظفر کے انتقال پر ملال کی جانکاہ خبر ملی۔۔۔
مجھے بہن کا ایس ایم ایس میسج ملا۔

City is just same only but Muzaffar Bhai is not there.

واقعی کسی کے چلے جانے سے محض ایک گھر، یا خاندان ہی متاثر ہوتا ہے، کاروبار حیات نہیں رکتا اور شاید یہی زندگی ہے۔''(۶۹)

افسانہ ''سراب'' میں ایک معصوم بچہ بطور گائید جو زندگی کی بھرپور علامت کے طور پر مصنف کا تخلیق کردہ کردار ہے۔اس کہانی کے مرکزی کردار "واحد متکلم" کو اپنی پر سرار شخصیت کی بدولت اپنے حصار میں جکڑ لیتا ہے۔اچانک موت کا شکار ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ افسانہ ''ٹوپچ'' کا مرکزی کردار "شکیل"، پائلٹ آفیسر کے کردار میں ہمارے سامنے آتا ہے۔اس کی پر کشش اور زندگی سے بھرپور شخصیت، یہ دونوں کردار اپنے حلقوں میں کافی مقبولیت رکھتے ہیں، مگر دونوں کی اچانک ناگہانی موت ہر کسی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ایک ناگہانی، زندگی کو موت کے سپرد کرتی ہے اور لواحقین کو سوگوار چھوڑ جاتی ہے۔

مصنف کے افسانوی مجموعے "مندر والی گلی" کا ایک افسانہ " شفٹنگ" بھی اپنی نوعیت کا ایک اہم افسانہ ہے۔ مصنف نے کمال خوبی سے ایک گھر سے دوسرے گھر کی شفٹنگ کو ایک دنیا سے دوسری دنیا کی شفٹنگ سے تعبیر کیا ہے۔اس افسانے میں شیشے کے ٹوٹنے کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ شیشے کا ٹوٹنا، عارضی پن کی علامت ہے۔ایک انہونی کا خوف اس افسانے کے کردار " امی جان" کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ جیسے کچھ ہونے کو ہے:

''ایک ننھا تھا جسے ایک ہی رٹ لگی تھی۔۔۔اور جو مجھے مخاطب کر کے بس یہی کہے جا رہا تھا۔ابا شفٹنگ ہو گئی۔۔۔بابا شفٹنگ ہو گئی۔۔۔نئے گھر میں جیسے ہر طرف

سے یہی آواز گونج رہی تھی۔۔۔ لگتا تھا نئے مکان کے در و دیوار کھڑکیاں اور دریچے۔۔۔ سب ننھے کے ساتھ مل کر چلا رہے تھے۔ باباشفٹنگ ہو گئی۔"(۷۰)

آپ کی بیشتر کہانیوں میں ایک گھٹن کا احساس ہمیشہ فرد کی آزادی پر مسلط ہے، اسی بارے میں آپ لکھتے ہیں:

"عجب لاعملی کی کیفیت تھی، میں نے اپنے آگے کھڑے ہوئے ایک شخص سے ڈرتے ہوئے پوچھ لیا۔ آپ کب سے قطار میں کھڑے ہیں؟ اور وہ روتی ہوئی آواز میں بے بسی سے بولا، مجھے تو اس اندھیرے میں کھڑے ہوئے نہ جانے کتنے جنم گزر چکے ہیں۔۔۔ نہ اندھیرا ختم ہوا نہ میرے سامنے موجود لوگوں کی قطار۔ اور نہ ہی مجھے ٹکٹ ملتا ہے۔ یوں لگا جیسے میرے اندر موجود کسی جاندار کا دم گھٹ گیا ہو۔"(۷۱)

آپ کے ہاں " موت "بطور موضوع ایک اہم اور اٹل حقیقت کے طور پر سامنے آتی ہے، اگر موت کا وجود نہ ہوتا تو زندگی کا تصور ماند پڑتا نظر آتا۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ آپ نے موت کے ذکر سے حقیقت میں زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مصنف اس حوالے سے "مندر والی گلی" کے تعارف میں لکھتے ہیں:

" میرے افسانوی مجموعے موسم جنگ کا کہانی محبت کی، پہ بات کرتے ہوئے ایک ممتاز افسانہ نگار دوست نے کہا تھا۔۔۔ معلوم نہیں ان کے افسانوں میں موت کا ذکر اس قدر کیوں ہے؟ ممکن ہے کہ ڈاکٹر ہونے کے ناطے یہ زندگی کی اس ہولناک رخ سے زیادہ قریب رہے ہوں اس حیات آب و گل میں شاید ہی کوئی ذی روح ایسا ہوگا جو زندگی کے اس المناک پہلو سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔۔۔"(۷۲)

یہ پریشانیاں، مشکل حالات اگر زندگی کا حصہ نہ ہوں ہو تو زندگی کی قدر و منزلت کو بھلا کیسے تسلیم کیا جائے ۔یہ زندگی بے رنگ تصور ہو۔ ہمیشہ ایک سے حالات زندگی کو منجمد کرنے کا سبب بنے رہیں۔ اس حوالے سے آپ اپنے افسانے "نئے شہر کے معنی" میں ان حالات کا اظہار مرزا غالب کے ایک مصرعے سے یوں کرتے ہیں:

"لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ پریشانی نہ ہو تو زندگی محض ایک کورے کاغذ کی مانند ہو اور بقول غالب نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا۔"(۷۳)

iv۔ سیاسی انتشار:

کسی ملک کے سیاسی حالات وہاں کے باسیوں پر براہ راست اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔انور زاہدی کی افسانہ نگاری مسلسل ارتقاء پذیری کے مراحل طے کرتی ہوئی ہمارے سامنے عصر حاضر کے مسائل کو اجاگر کرتی ہے۔آپ کے افسانوں میں سیاسی انتشار اور سیاسی حالات میں ابتری کو مختلف علامتوں کی مدد سے عصر حاضر کے افراد کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔اس ملک کا حصول ایک خاص مقصد کے تحت ہوا تھا۔جہاں ایک مثالی معاشرے کا قیام اور جمہوریت کے نظام کو فروغ حاصل ہونا تھا۔مگر سیاسی حالات میں عدم استحکام نے سارے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔اردو ادب کی تمام اصناف کے ساتھ ساتھ اردو افسانے نے اس عظیم واقعے اور اس کے اثرات کو قبول کیا۔پاکستان کا قیام اور اس دنیا کے نقشے پر اس کا ظہور کوئی آسان و قابل فہم نہ تھا۔اس کے پس منظر میں بے پناہ قربانیاں اور انتھک کاوشیں تھیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر طاہرہ اقبال اپنے مقالے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''پاکستان کا وجود میں آنا ایک بڑا تاریخی واقعہ تھا، لیکن افسانے میں اس کی تشکیل اور آزادی کے حوالے سے کوئی خاص گرمجوشی نظر نہیں آتی، لیکن اس کے بطن میں پیدا شدہ حالات و واقعات اور سانحات پر بہت کچھ لکھا گیا۔مہاجرین کے مسائل، نئی زمینوں سے ہم آہنگی نہ پیدا کرنے کا دکھ، غیر مستحکم اور خود غرض سیاسی قوتوں کے ناعاقبت اندیشانہ فیصلوں نے جو مایوسیت پیدا کی، اس کا ظہور بھی ہوا لیکن اس سارے عبوری حالات کو مارشل لاء نے بالکل ہی پلٹ کر رکھ دیا۔''(۷۴)

سیاسی انتشار موضوع کے طور پر آپ کے افسانوں میں کہیں نہ کہیں پس منظر میں دکھائی ضرور دیتا ہے۔انور زاہدی کے افسانوں کے موضوعات سے متعلق منشایاد لکھتے ہیں:

> ''ان کی کہانیاں ایک طرف انسانی نفسیاتی پیچیدگیوں کے گہرے مطالعے پیش کرتی ہیں، تو دوسری طرف فرد، معاشرے اور بستیوں کی محرومیاں، دکھ، مصائب اور سیاست کی بداعمالیوں کے نتیجے میں پیدا شدہ عوارض کی نشاندہی کرتی ہیں۔''(۷۵)

''عذاب شہر پناہ''کا افسانہ ''دوسرے سیریز کی موت'' سیاسی حالات کی بخوبی ترجمانی کرتا ہے۔ مارشل لاء کے بعد کی صورتحال کا عکاس یہ افسانہ آمریت اور جبریت کی فضا کا احاطہ کرتا ہے۔ مختلف ڈرامائی کرداروں کی صورت میں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے حالات کو بیان کرتا ہے۔ مارک اینٹنی کی صورت میں اس عہد کے آمر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

''اس کے منہ سے اول فول کی بوچھاڑ جاری ہے، وہ خود نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ بس بولے جارہا ہے اور بھاری بوٹوں کا حصار، اس کے اور کٹے ہوئے کانوں کے پہاڑ کے درمیان موجود ہے۔ بے چینی چھوت کے مرض کی طرح ایک دوسرے کو لگ رہی ہے۔ ہر شخص یوں مضطرب ہے، جیسے وہ کچھ کھو بیٹھا ہے۔ اضطراب وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔۔۔''(۷۶)

عالمی سطح پر سیاسی حالات کی روز بروز بدلتی ہوئی صورتحال نے پورے منظر نامے کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ دو عالمی جنگیں جو پوری دنیا میں تباہی کا باعث بنیں۔ اب دنیا کے حالات تیسری عالمگیر جنگ کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کریں گے۔ تیسری عالمی جنگ اور پوسٹ وار پیریڈ کا ذکر انور زاہدی کے افسانے "سرد ہوا" میں کچھ اس طرح ملتا ہے:

'' میرے ذہن میں صور اسرافیل بج رہا ہے۔ پوسٹ وار پیریڈ کے ختم ہونے کی گھنٹی بج جانے کا خوف میرے اعصاب کو منجمد کر چکا ہے۔ میرے پاؤں وولن ساکس اور لانگ بوٹس میں ہونے کے باوجود یخ ہیں۔ اندر باہر ڈر کا مہیب سناٹا اپنی بانہیں کھولے کھڑا ہے اور آسمان پر تاریک بادلوں کے دیو گرج رہے ہیں۔ پہاڑوں پر فٹوں برف پڑ چکی ہے۔ تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔۔۔ سرد ہوا چل رہی ہے۔ انتہائی سرد اور برف میں بجھی ہوئی۔''(۷۷)

خوف کی فضا، سیاہ بادلوں کی گھن گرج، برف اور سرد ہوا سب وہ علامتیں ہیں جو پوری دنیا میں ڈر اور عدم تحفظ کی وجہ بن رہی ہیں۔ اس عالمی صورتحال اور سیاسی حالات نے پاکستانی سیاسی حالات پر ہمیشہ گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ کہنا بجا ہے کہ پاکستان کو ان ستر سالوں میں سیاسی استحکام نصیب نہیں ہوا۔ ملک کو ترقی کی منازل طے کرنے کے لیے سیاسی استحکام ضروری ہے۔ حکومتی پارٹیوں کے ذاتی مفادات، اپوزیشن کا حکومت کو ناکام بنانے کے نت نئے ہتھکنڈے، آئے دن احتجاج، لانگ مارچ، فوجی مداخلت، گرفتاریاں دھرنے، مارشل

لاء، یہ سب اس اسلامی مملکت کا معمول بن چکے ہیں۔ انور زاہدی اپنے افسانے مجموعے " مندر والی گلی" کے افسانے "سب جیتے جی کی باتیں ہیں" جو اس صورت حال کی عکاسی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

" مارشل لاء کے دن تھے۔ ہم نے تو خیر آنکھیں مارشل لاء تلے کھولی تھیں۔ یہ جنرل یحییٰ کا مارشل لاء تھا۔ ملک بھر کے کالجوں میں اسٹرائیکس ہو رہی تھیں۔ اس وقت ڈاکٹر، انجینئر، لیکچرار حضرات خود اپنی تصویر کی تصدیق نہیں کر سکتے تھے کہ یہ درجہ اول کے افسر نہیں گنے جاتے تھے۔۔۔ تب درجہ اول کے افسران کچھ اور لوگ ہوتے تھے۔"(۷۸)

اپنے افسانوں میں مصنف خارجی صورتحال اور معاشرے کے فرد پر اس کے اثرات کو آپ بیتی کے ذریعے جگ بیتی بنا دیتے ہیں۔ اس معاشرے میں جو کچھ بحیثیت فرد وہ خود داخلی سطح پر محسوس کرتے ہیں اپنے قاری تک اسے پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان خارجی حالات نے انسان کو داخلی سطح پر شدید اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس بے یقینی، بے بسی میں اندرونی کیفیت کو زبان تک لانے میں آج کا فرد بے بس نظر آتا ہے۔ اس کی مثال آپ کے افسانے "جنگل کٹنے والا ہے" میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے:

"میرا حلق خشک ہے، میری زبان پر پیاس نے کانٹے بو دیئے ہیں۔۔۔ کانٹے بڑے ہوتے جا رہے ہیں، حلق میں کانٹوں کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔۔۔ میں چیخنا چاہتا ہوں ۔۔۔ لیکن قوت گویائی میرا ساتھ نہیں دیتی۔"(۷۹)

اس سیاسی انتشار کی بدولت فرد صحیح سمت کا تعین کرنے سے قاصر ہے۔ انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں منجمند ہو گئی ہیں۔ کوئی نجات دہندہ نظر نہیں آتا، جو اس کیفیت سے نکال باہر کرے، جو داد رسی کرے۔ ہر طرف سخت اندھیرے کی سی کیفیت ہے۔ اس اندھیرے میں سمت تلاش کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

اس ملکی سیاسی صورتحال پر مصنف تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ وہیں اپنے قاری کو مایوسی و ناامیدی کے اندھیروں میں گرنے سے روکنے کی سعی کرتے ہیں۔ جب قومیں مایوسی کی دلدل میں دھنس جاتی ہیں، تو دنیا میں اپنا وجود کھو دیتی ہیں۔ آپ پر امید ہیں، اس بات کی وضاحت اس اقتباس سے بخوبی لگائی جا سکتی ہے:

"زمین کتنی ہی بے آب و گیاہ کیوں نہ ہو، قدرت اس میں کبھی کبھی ایسے پھول ضرور کھلاتی ہے، جو گزرے ہوئے بد عہد ادوار کی یادوں کو انسانی ذہن سے محو کرنے کے لئے، خود ایک حسین یاد بن جاتے ہیں۔۔۔ بالکل اس تازہ ہوا کے

جھونکے کی مانند جو زیر زمین قید خانوں میں کسی درز سے گزر کر پابند سلاسل ، موت کے منتظر قیدیوں کے ماتھے کو چوم کر ان میں جینے کی نئی آرزو پیدا کر جاتا ہے۔"(۸۰)

v ۔نفسیاتی پیچیدگیاں:

انور زاہدی کے افسانوں میں جہاں دیگر موضوعات آپ کی فکر کی عکاسی کرتے ہیں، وہیں انسانی نفسیات بطور موضوع خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ انسانی وجود سے وابستہ خارجی حالات و داخلی کیفیات، شعور اور لاشعور کی تکرار، حقیقت اور خواب کی درمیانی کیفیت، خود کلامی، خواب میں حقیقت کا واہمہ جیسے موضوعات انور زاہدی کی کہانیوں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ آپ کی کہانیاں، انسانی نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ کرتی ہوئی، نفسیاتی الجھنوں کو بیان کرتی ہیں۔ یہ نفسیاتی پیچیدگیاں، آپ کے چاروں افسانوی مجموعوں کی بیشتر کہانیوں کا حصہ ہیں۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ اور زندگی کے تجربات سے لئے گئے موضوعات عام آدمی کی ذہنی سطح کی عکاسی کرتے ہیں۔

آپ نے انسانی نفسیات کا مطالعہ بطور طبیب اور ادیب دونوں طرح سے کیا ہے۔ اس حوالے سے ۱۹۹۶ء میں "لاشعور تک رسائی" کے نام سے آپ کی ایک تصنیف منظر عام پر آئی جو کہ یونگ کی کتاب "Approaching of Unconscious" کا ترجمہ ہے۔ انور زاہدی کے زمانے کا انسان اپنی داخلی اور خارجی سطح پر جبر کا شکار ہے۔ مسلسل جبر کی کیفیت، جہاں بے بسی اور بے چارگی کو جنم دیتی ہے، وہیں انسانی سوچ اور فکری عمل کو مفلوج بھی کرتی ہے۔

افسانہ "ماتم بال وپر کا" سے اقتباس ملاحظہ ہے:

"نفسیاتی طور پر ہم شاید اذیت پسند ہو گئے ہیں۔۔۔ ہم ازل سے صرف اپنی عافیت کی فکر میں مگن رہے ہیں۔ دوسروں کی تباہی ہمیں ہمیشہ ٹی وی اسکرین پر چلنے والی رنگین مار دھاڑ فلم سے مماثل نظر آتی ہے۔ اور بس عجیب نفسا نفسی کا عالم ہے۔ ہر شخص کیا بڑا کیا چھوٹا، اپنی جان بچانے کی کوشش میں ہے۔ بچے پاؤں تلے روندے جا رہے ہیں۔ جو بعد میں پگھلے ہوئے لاوے میں سمٹ کر آنے والے زمانوں کے لئے تصویر عبرت بن چکے ہیں۔ کیا انسان نے کبھی بھی عبرت حاصل کی ہے۔۔۔؟"(۸۱)

حالات فرد کی نفسیات پر اثرانداز ہوتے ہیں۔انفرادی سطح بلکہ اجتماعی سطح پر بھی انسانی نفسیات مختلف پیچیدگیوں کا شکار ہوتی چلی جاتی ہیں۔انسان ذہنی طور پر مفلوج اور خود کو بے بس تصور کرنے لگتا ہے۔معاشرے میں عدم تحفظ اور خوف جیسی کیفیات کا جنم لینا، جبریت ہی کے مرہون منت ہے۔

عصر حاضر کے حالات وواقعات اور جنگ وجدل کے دور نے انسانی نفسیات پر اپنی گہری چھاپ چھوڑ دی ہے۔ہمارے اذہان اس ماحول کے عادی ہوتے جارہے ہیں۔مصنف کے لاشعور میں عصر حاضر کی آمریت اور سائنسی و مشینی عہد کا عروج، آپ کی کہانیوں میں جابجا جھلکتا نظر آتا ہے۔اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ہمارا معاشرہ صنعتی ترقی کی آڑ میں فطرت سے اپنا ناطہ توڑ چکا ہے۔انسان،انسان سے کوسوں دور ہے۔وقت کو جیسے تیز رفتاری کے پر لگے ہوں۔ایسے معاشرے میں زندگی کے ہر شعبے میں،دن بدن نئے تجربات سے واسطہ پڑ رہا ہے۔اس ضمن میں صبا اکرام رقم طراز ہیں:

> '' آدمی کے تجربات کی کڑیاں ایک ایک کر کے جڑتی جاتی ہیں اور زنجیر سی بنتی جاتی ہے۔یعنی زندگی میں ایک طرح کا تسلسل قائم رہتا ہے، جو آدمی کو اس کے ماضی سے کٹنے نہیں دیتا۔اس کی یاداشت کے آئینے میں ہر گزرے ہوئے کل کا کوئی نہ کوئی تجربہ یا مشاہدہ منعکس ہو کر محفوظ ہو جاتا ہے۔اور اس طرح اس کے اندر ہی اندر،اس کی اپنی ایک تاریخ مرتب ہوتے رہنے کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے۔ یہی سلسلہ آدمی کی پہچان برقرار رکھتا ہے۔''(۸۲)

آدمی کی پہچان اور معاشرے میں اس کا مقام ہی اصل میں اسے جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔اگر معاشرے کا فرد نفسیاتی الجھنوں کا شکار اور اپنے ماضی سے کٹا ہوا ہو گا تو وہ اپنا وجود کیسے برقرار رکھ سکے گا۔افسانوی مجموعہ " عذاب شہر پناہ "آدمی کی گمشدگی، عصری جبریت، بے حسی، معاشرے کے جمود جیسے موضوعات کا عکس ہے ۔دیگر افسانہ نگاروں کی روش پر چلتے ہوئے آپ نے مختلف علامتوں کے ذریعے اپنے لاشعور میں موجود فکری رجحانات کو اپنے قارئین تک پہنچایا ہے۔جب معاشرہ اجتماعی طور پر بے حسی کا شکار ہو، افراتفری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو، ایسے میں ظلم وستم کا پروان چڑھنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔آپ عام انسان پر ان حالات وواقعات کے اثرات کو بیان کرتے ہیں، جو انسان سے اس کا حقیقی چہرہ چھیننے کا باعث بنے ہیں۔بے چہرہ، سہمے ہوئے لوگ معاشرتی طور پر اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔ہر طرف ہو کا عالم ہے کہیں کوئی چارہ نہیں۔ہر طرف خشک سالی کی رت ہے۔

پورا معاشرہ نفسیاتی طور پر فکری لحاظ سے کھوکھلے پن کا شکار ہو چکا ہے۔ مصنف کے نزدیک قحط کی یہ رت ہرے بھرے میدانوں اور باغیچوں کو بنجر بنانے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ معاشرتی طور پر انسان کا وجود کہیں کھو گیا ہے۔ عدم تحفظ اور گھٹن کی یہ فضا ایک تجرباتی و تحقیقی تجربہ گاہ کا منظر پیش کرتی ہے۔ جہاں پر آئے دن مختلف حیوانات تجربات کی بھینٹ چڑھتے ہیں اور پھر موت ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔

انور زاہدی کے ہاں انسانی ذہن مختلف تجربات اور کیفیت سے گزر کر اپنے لاشعور میں ایک ایسی دنیا تشکیل دیتا ہے، جو کہ بعد ازاں شعور اور تحت شعور کے ذریعہ دوسروں پر عیاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انسانی نفسیات کی یہ تینوں دنیائیں انسان کی شخصییت پر اثرات بھی مرتب کرتی ہیں۔ "رات" بطور علامت آپ کے کئی افسانوں میں استعمال ہوئی ہے۔ یہ تاریکی پورے معاشرے کو تاریک کردے گی۔ اندھیرے کا یہ خوف اجتماعی سطح پر معاشرے کے افراد کے دلوں پر چھا رہا ہے۔ لاشعور میں رچا بسا یہ خوف، ہمیشہ کسی انہونی کے انتظار میں رہتا ہے۔ مصنف ڈر اور رات کی اس کیفیت کو اپنے افسانے "قصہ درد کی رات کا" میں کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

> ''میری نظر اپنے بازو پر پڑتی ہے، وہ جگہ جہاں گلوکوز کی ڈرپ لگی رہی ہے۔ اب گہرے نیل میں ڈھل چکی ہے۔ کبھی کبھی ڈرپ کی سوئی خون کی ورید کو یوں چھید ڈالتی ہے کہ جلد کے نیچے خون جمع ہو جاتا ہے۔ نیل کی شکل میں ایک دھبہ نمودار ہو جاتا ہے۔ نیلا دھبہ میری آنکھوں میں تیرتا ہے اور تیرتے تیرتے آنکھوں کے پانیوں میں اپنی ہیئت بدلنے لگتا ہے۔ میرا سر چکراتا ہے، کمرے کی دیواریں مجھے گھومتی ہوئی لگتی ہیں۔ میرے بازو پر پر پھیلا نیل اپنی رنگت بدل رہا ہے۔ آہستہ آہستہ دھبہ اپنی جسامت میں بڑھ رہا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ بڑھتے بڑھتے پورے ماحول پر چھا جائے گا۔''(۸۳)

یہاں نیلا دھبہ اسی خوف کی علامت ہے۔ جو مصنف کے لاشعور میں کہیں موجود ہے۔ مصنف کو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ نیلا دھبہ پورے ماحول پر چھا جائے گا۔ پاکستان میں جمہوریت کا سفر ہمیشہ سے ہی مارشل لاء کی زد میں رہا۔ ان ہی مارشل لاء کے سبب ڈر اور وحشت کی یہ کیفیت اس معاشرے میں پروان چڑھی۔ خوف اور جبریت کی یہ کیفیت ۷۰ اور ۸۰ کی دہائیوں میں تخلیق کیے جانے والے ادب، بالخصوص طور پر افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہے، اس بارے میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

"یہ دور افسانے میں دروں بینی کا دور ہے۔ مارشل لاء نے آہستہ آہستہ اپنے پنجے پھیلانے شروع کئے، تو اس کا خوف اور جبر معاشرے کی مختلف سطحوں میں سرائیت کر گیا۔ خوف اور بے سمتی کی اس مجموعی فضا نے داخلیت اور نئی مابعد الطبیعیاتی فکر کو جنم دیا۔"(۸۴)

ان حالات کے پیش نظر مصنف کے لاشعور میں چھپا خوف، تحت الشعور کے ذریعے سے ان کے تخلیق کیے گئے کرداروں سے عیاں ہوتا ہے۔ ہمیشہ انہونی کا خوف اور اندیشوں اور وسوسوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ بعد ازاں یہی اندیشے اضطراب کی کیفیت کو جنم دیتے ہیں:

"بے چینی چھوت کے مرض کی طرح ایک دوسرے کو لگ رہی ہے۔ ہر شخص یوں مضطرب ہے جیسے وہ کچھ کھو بیٹھا ہو۔ اضطراب ایک وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ کوئی بھی اپنی بے چینی کی وجہ سے واقف نہیں۔ انسان بدستور کالے پرندوں میں چھپا ہوا ہے۔ جن کے چونچوں میں کنکر ہیں۔"(۸۵)

انور زاہدی کی کہانیوں میں انسانی نفسیات کے حوالے سے خواب بطور اہم موضوع کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ خوابوں کی دنیا سے آپ اچانک موجودہ صورتحال کا تقابل ایسے احسن انداز میں کرتے ہیں کہ قاری خود کو اس خواب کا حصہ سمجھتا ہے۔ عصر حاضر میں انسان کی حیثیت ایک ریموٹ کی سی رہ گئی ہے۔ اس ڈپریشن اور افراتفری نے انسانی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بے چینی، اکتاہٹ، خوف اور بے یقینی کی ان کیفیات نے زندگی کے وہ رنگ مدہم کر دیئے، جو کچھ دہائیوں میں اپنی پوری آب وتاب سے زندگی کے کینوس پر خوبصورتی بکھیرتے تھے۔ "خواب سا دن" بھی ایسا ہی افسانہ ہے، جس کا مرکزی کردار "عاصم بھائی" روزمرہ کی دلدل میں اس قدر دھنس چکا ہے کہ خود کو آزاد کرنا اس کے لئے ممکن نہیں رہا۔ اس کے اعصاب مسلسل گھٹن اور کام کی وجہ سے شدید تناو کا شکار ہیں۔ وہ ایک نفسیاتی مریض بن چکا ہے۔ وہ اپنے گھر میں خود کو اس قدر اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے کہ اپنے اہل وعیال تک کو پہچاننے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ انور زاہدی ایک خواب کے ذریعے اس افسانے میں تحلیل نفسی کے ذریعے اپنے مرکزی کردار "عاصم بھائی" کے لاشعور تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

روزمرہ زندگی میں مسلسل کام اور ہر وقت انسانی ذہن میں اپنے کام سے متعلق سوچ، مختلف نفسیاتی پیچیدگیوں کو جنم دیتی ہے۔ انسانی ذہن تھکاوٹ کا شکار ہونے لگتا ہے۔ یہ تھکاوت اور گھٹن لاشعور کی مختلف

تہوں کا حصہ بنتی جاتی ہے اور انسان نفسیاتی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ جب سے ان مشینوں کا انسانی زندگی میں عمل دخل شروع ہوا ہے، انسان کا اپنی مٹی سے رشتہ کمزور ہوا ہے۔ مسلسل ایک جیسی روٹین نفسیاتی سطح پر فرد کو مفلوج کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اس حوالے سے مصنف کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''آنکھ لگے ہوئے کچھ وقت ہی گزرا ہو گا، اچانک یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی طوفان زدہ صحرا میں داخل ہو گیا ہوں۔۔۔ تازہ مٹی کی بو میرے سانس میں شامل ہو کر پورے جسم میں اترے جا رہی ہے۔۔۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔''(۸۶)

''مٹی کی بو'' کے عنوان سے یہ افسانہ ''عذاب شہر پناہ'' میں شامل ہے۔ اس افسانے کا ''واحد متکلم'' شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ اس کا ذہن مسلسل حالات میں ابتری اور مسلسل کام سے اکتا چکا ہے۔ مصنف کے نزدیک ''مٹی کی بو'' فطرت کی طرف اشارہ ہے۔ انسان جیسے جیسے ترقی کی منازل طے کر رہا ہے، فطرت سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ مٹی کی بو کہانی کے واحد متکلم کو یہ باور کروانا چاہتی ہے کہ وہ خود کو فطرت سے قریب کرے۔ فطرت کے دلکش مناظر سے اپنے ذہن کو تازگی بخشے۔ سوچ کے زاویے کو صرف غم روزگار تک ہی محدود رکھنا ،خود سے ناانصافی ہے اور خرابی صحت کا باعث ہے۔

خواب انسانی زندگی کا لازمہ ہیں۔ خواب کے ذریعے انسان کے لاشعور تک رسائی ممکن ہو سکتی ہے۔ خواب انسانی نفسیات کا لازمی جزو ہیں۔ تحلیل نفسی کے طریقہ علاج کے ذریعے انسانی نفسیات کی مختلف الجھنوں کا سدباب کیا جا سکتا ہے۔ انور زاہدی کے مطابق خواب دیکھنا انسان کو نفسیاتی طور پر صحت مند رکھتا ہے۔ بعض احباب اسے ایک مرض گردانتے ہیں مگر یہ مرض نہیں، انسانی ذہن کی ضرورت ہے۔ آپ اپنی کہانی ''فن کاری'' میں خوابوں کی اہمیت کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

> ''بعض لوگ خوابوں کے دیکھنے کو خرابی صحت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان پر ذرا بھی یقین نہیں کرتے جبکہ ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ ہم سب ہر شب ان گنت خواب دیکھتے ہیں۔ ان میں سے محض کچھ یاد رہ جاتے ہیں۔ ان کے بقول اگر ہم خواب نہ دیکھیں تو جینا عذاب ہو جائے اور پھر یہی نہیں، بعض خواب تو آنے والے واقعات کی طرف ہماری توجہ بھی دلاتے ہیں۔''(۸۷)

خواب، لاشعور میں چھپی جبلتوں کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ گھٹن زدہ ماحول، معاشرے کے افراد کی بے حسی، اخلاقی اقدار کا زوال، مادیت پرستی کی فضا، انہونی کا ڈر یہ سب وہ عناصر ہیں، جو انسان کو ذہنی طور پر مفلوج

کرتے ہیں اور اسی بناپر پورا معاشرہ جمود کا شکار ہو چکا ہے۔ آپ افسانوی مجموعے "موسم جنگ کا، کہانی محبت کی" کی بیشتر کہانیوں میں انسانی نفسیات اور خوابوں کو اپنا موضوع تحریر بناتے ہیں۔ ان افسانوں میں "پھپھوندی"، "اسٹل لائف"، "فنکاری" اور "مینار سکوت" جیسے افسانے شامل ہیں، جو کہ انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے پیش کرتے ہیں۔ جنسی ناآسودگی، خواب اور حقیقت کا واہمہ، انہونی کا خوف، ناسٹلجیائی عناصر، خود کلامی جیسے نفسیاتی موضوعات آپ کے افسانوں میں جابجا ملتے ہیں۔ خوابوں کی اہمیت کے حوالے سے آپ لکھتے ہیں:

> ''میرے خیال میں یہ خواب ہی ہیں جو ہمیں زندہ رہنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ ورنہ حقیقتیں تو اس قدر بھیانک ہو گئی ہیں کہ جس کا سامنا کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔''(۸۸)

خود کلامی بھی ایک نفسیاتی مسئلے کے طور پر تب سامنے آتی ہے، جب انسان اپنی خارجی و داخلی کیفیتوں میں توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کا کوئی ذریعہ اسے میسر نہیں آتا۔ خارجی ماحول کے اثرات، مختلف حوادث اور حالات و واقعات، داخلیت پر براہ راست اثرانداز ہوتے ہیں۔ جس قدر خارجی سطح پر زندگی ربط اور سکون کی حامل ہو گی، انسانی ذہن اس قدر پر سکون اور اور مثبت سوچ کا حامل ہو گا۔ مصنف کے چاروں افسانوی مجموعوں میں خود کلامی کے عناصر بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مصنف کا "میں" اور "وہ" خود سے سوالات کرتا دکھائی دیتا ہے، پھر ان کے جوابات کے لیے تو وہ اپنی ذات سے ہم کلام ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

کبھی واحد متکلم "میں" کے روپ میں نظر آتا ہے، تو کبھی "وہ" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اپنے اندر کے خمار اور خیالات کا واحد حل خود سے ہمکلام ہو کر، اس سے سوال و جواب کر کے، تجزیے کی شکل میں نکلتا ہے۔ "بائسکوپ دن" افسانوی مجموعے میں دوسرے مجموعوں کی نسبت خود کلامی کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔

انور زاہدی کے افسانوں کا "میں" درحقیقت آپ کی اپنی ذات ہے۔ آپ کے بچپن، جوانی کے مختلف واقعات، مختلف کرداروں یا واحد متکلم کے روپ میں اس معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ معاشرتی زندگی جو اب ناپید ہے۔ مادیت پرستی، انفرادیت پسندی نے جس کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے:

> ''میں تنہا اپنے محلے کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔۔۔ پرانے وقت کا ایک ایک دوست اور بچپن میں ساتھ کھیلے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کے چہرے، میری آنکھوں کے

سامنے تھے۔ لیکن سب کے سب برستے ہوئے بادلوں کی طرح یادوں کے آسمان
پر اڑتے چلے جارہے تھے۔۔۔ گلیاں اب سونی پڑی تھیں۔"(۸۹)

مصنف اپنے آج کو سامنے رکھتے ہوئے، اپنے کل کی تلاش میں سر گرداں نظر آتے ہیں۔ آپ کا کل آپ کے لیے سکون قلب کا باعث ہے۔ عیاں منظر پوشیدگی کا لحاف اوڑھ رہا ہے۔ نئے لوگ، نئی سوچ، نئے رجحانات سب اپنے ماضی سے نالاں ہیں۔ منظر تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ افسانہ "غائب از نظر" مصنف کے انہی خیالات کی عکاسی ہوتی ہے:

"وہ جو بھی تھا، خود کو متعارف کرانے کی بجائے بہت دور چلا گیا تھا۔ آسمان پر بے
شمار ستارے دمک رہے تھے۔ منظر تیزی سے بدل رہا تھا۔۔۔ میں پسینے میں شرابور
تھا۔۔۔ کبھی سب کچھ صاف نظر آتا تھا۔ کبھی جیسے دھند چھا جاتی۔۔۔ میری
آنکھوں کے سامنے جو موجود تھا۔۔۔ وہ اب غائب تھا۔ اور جو غائب تھا۔۔۔ وہ ہر
بار ایک نئے رنگ میں ظاہر ہو رہا تھا۔"(۹۰)

انور زاہدی کے بعض افسانوں میں "جنس" بطور موضوع، ایک اہم فکری زاویے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ آپ کے یہاں یہ موضوع لڑکپن سے جوانی کے زمانے کے جنسی مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ جنسی ناآسودگی، اولاد کا نہ ہونا، عہد شباب میں شدید جنسی ہیجانات انسانی ذہن کو جکڑنے کا باعث بنتے ہیں۔ مصنف نے انسانی نفسیات میں جنس کو خاصی اہمیت دی ہے۔ چاروں مجموعات میں جنس کا موضوع کسی نہ کسی حوالے سے آپ کی تحریروں کا حصہ ہے۔ ان مجموعوں میں یہ موضوع انسانی نفسیاتی پیچیدگیوں اور محرومیوں کی عکاسی کرتا ہے۔

""کوئی موسم ہو"، "سورج مکھی کے پھول"، "خواب کی رات"، "انتہائے
شب"، "کھیل ختم"، "پھپھوندی" جیسے افسانے جنسی لحاظ سے انسانی نفسیاتی
الجھنوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ عینک کے اوپر سے دیکھ کر اسے کہتا ہے، "آج
شام نرسری سے دوسرا منی پلانٹ لے آئیں گے" وہ بغور اپنے شوہر کے چہرے کو
دیکھتی ہے۔ جیسے کچھ پڑھنا چاہتی ہو، لیکن شوہر کا سدا کا جذبات سے عاری چہرہ
، اسے اخبار کے سینسر ڈ کالم کی طرح کورا نظر آتا ہے۔"(۹۱)

"کوئی موسم ہو" میں مصنف ایک عورت کی محرومیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جس کی شادی کو قریب آٹھ سال ہونے کو آئے ہیں، مگر اولاد جیسی نعمت سے محروم ہے۔ شوہر کی جانب سے عدم توجہ اور جنسی ناآسودگی نے عورت کو شدید ذہنی بیمار بنادیا ہے۔ اس کے لیے یہ بناسنورا گھر کسی قید بامشقت سے کم نہیں۔ وہ خود کو ایک بنجر زمین تصور کرنے لگتی ہے، جس میں ہریالی ناگزیر ہے۔

مصنف کا افسانہ " پھپھوندی" بھی جنسی ناآسودگی جیسے موضوع کا حامل افسانہ ہے۔ اس افسانے کے بارے میں حمید شاہد اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''افسانہ "پھپھوندی" میں وراثت میں ملنے والے ہیجان کے منفی اثرات کو اس خوبی کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے کہ افسانہ ایک جمال پارہ بن گیا ہے۔''(۹۲)

"پھپھوندی" کا مرکزی کردار 'مشتاق' نفسیاتی طور پر پھپھوندی سے اس قدر خائف ہے کہ کبھی اسے اچار میں پھپھوندی لگی نظر آتی ہے، تو کبھی گیلی روٹی پر، کبھی وہ اپنے خاندان کے افراد کے ذہنوں کو پھپھوندی لگا تصور کرتا ہے:

> ''کبھی کبھی وہ سوچتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ پھپھوندی انسان کے دماغ کو لگ جاتی ہو اور پھر اسے ہر چیز میں پھپھوندی لگی نظر آتی ہو۔۔ گھر میں آپا کے دماغ میں پھپھوندی لگ گئی تھی۔ اب اسے حکیم جی پھپھوندی زدہ نظر آرہے تھے۔''(۹۳)

وراثت میں ملا ہیجان اور گھر کے ماحول نے "مشتاق" کے ذہن پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ وہ ہر وقت نفسیاتی دباؤ کا شکار رہتا ہے۔ جنس پرستی اور اپنے والد کے رویے نے اسے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے۔ یہ کردار اپنے والد کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے جس سے اس کی ذہنی سطح کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

> '' اس کے ابا نے جو کسی سرکاری کسی سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے فارغ اوقات میں سوائے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے اور بچے پیدا کرنے کے کوئی اور کام کیا ہی نہ تھا۔۔۔ ایک اس کی ماں تھی جو ہر وقت گھر کے کاموں میں لگی رہتی اور ہر سال آبادی میں اضافہ کرتی۔''(۹۴)

جنسی طور پر ناآسودہ 'مشتاق' اندر ہی اندر گھلے جا رہا تھا۔ احساس کمتری کے احساس نے اس کا بسا بسایا گھر تباہ کر دیا تھا۔ محرومی اور ناآسودگی جیسے احساسات نے اسے جذبات سے عاری شخص بنا دیا تھا۔

یہی صورتحال مصنف کے افسانے "کھیل ختم" میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ لڑکپن سے جوانی کی منازل طے کرتا مصنف کا کردار "مانی" جنسی تجسس کا شکار ہے۔ "مانی" اس افسانے کا مرکزی کردار ہے، جو سلمہ باجی کی اداؤں پر فدا ہو چلا ہے۔ لیکن عمروں کے فرق نے مانی کو ہمیشہ بچہ ہی رہنے پر مجبور کیے رکھا:

> ''میں نے آگے بڑھ کر پردے ہٹائے، تو میری آنکھوں کے سامنے ایک عجیب و غریب منظر تھا۔۔۔ کہ باجی کی پشت میری طرف تھی۔۔۔ وہ وہاں کمرے کے وسط میں ایک نوجوان کی بانہوں میں جکڑی کھڑی تھی۔''(۹۵)

جنسی کشش اور اس کا تجسس، خصوصی طور پر بچپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہوئی نئی نسل کی نفسیات اور ان کے مستقبل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ صحیح اور بروقت رہنمائی، ان کی بہتر ذہنی تشکیل اور اچھے مستقبل کے لیے بہت ضروری ہے۔

انور زاہدی کے افسانوں میں جنسی موضوع تہذیبی قدروں سے جڑا ہوا ہے۔ مشینی ترقی کی وجہ سے مادیت پرستی کو فروغ حاصل ہوا۔ اس مادیت پرستی نے معاشرے کے افراد میں ہوس کو پروان چڑھایا۔ ہوس زر نے انسان سے انسانیت چھین لی۔ موجودہ معاشرے کے فرد کے اس رویے کے بارے میں صبا کرام لکھتے ہیں:

> ''اس نے اپنی زندگی کے سر سے شرم و حیا کی چادر اٹھا کر اپنے گھر کے ایک کونے میں کھونٹی پر ٹانک دی اور گلے سے دیانت داری اور سچائی کی مالا اتار کر طاق میں رکھ دی۔ پھر جب باہر نکلا تو دولت کے حصول کی راہ میں اس سے ایسی گھناؤنی حرکتیں سرزد ہوئیں، جنہوں نے معاشرے میں غلاظت اور گندگی کا ڈھیر کھڑا کر دیا۔''(۹۶)

یہی مادیت پرستی، ہوس پرستی کا روپ دھارتی چلی جاتی ہے۔ حلال و حرام میں تمیز نہ کرنا، انسان کو درندگی کی طرف لے جاتا ہے:

> ''اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی جوان خوشبو میں، ملی جلی بدبوئیں شامل ہو گئی ہیں، چمکتی وردیاں داغدار ہیں۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے قدم کسی چیز سے ٹکراتے ہیں۔۔۔ گالیاں اور بھونکنے کی آوازیں ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر پھینکنے پر پھیلتی

ہوئی لہروں کی طرح ابھرتی ہیں۔۔۔"حرام زادے فٹ پاتھ بھی نہیں
چھوڑتے"۔"(۹۷)

ہوس جائز و ناجائز کی تمیز ختم کر دیتی ہے۔انسان اپنی عزت و آبرو کو بیچ ڈالتا ہے۔مصنف کا افسانہ " پس دیوار" میں مصنف ایک ایسی بے بس ولاچار خاتون کا احوال قلم بند کرتے ہیں جس کا شوہر شرابی اور عیاش ہے۔وہ اپنی بیوی سے جسم فروشی کروانا چاہتا ہے۔تاکہ وہ اپنی ضروریات اور ہوس کو مٹا سکے:

" یہ کیوں آپ کو اس بے دردی سے مارتا ہے۔۔۔؟اور آپ آخر یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتیں مجھ سے آپ کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔میں بے تکان بولے جارہا تھا۔وہ چپ تھی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارے بہہ رہے تھے۔"(۹۸)

vi۔حکومتی بدانتظامی:

انور زاہدی حکومتی بدانتظامی پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔آپ کے افسانوں میں جابجا حکومت کی بدانتظامی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔آپ کے نزدیک حکومت کے بنیادی ستون کھوکھلی بنیادوں پر کھڑے ہیں۔انتظامی امور میں عدم دلچسپی، حکومتی پارٹیوں اور اپوزیشن کے مابین آئے روز دنگا فساد، جلسے جلوس اور پکڑ دھکڑ، اب یہاں کا معمول بن چکا ہے۔آمریت ہو یا جمہوریت دونوں نے ہی عوام کو ناکوں چنے چبوائے۔شہروں میں ہر طرف سرد ہوا کا دور دورہ ہے، جہاں سرد ہوا سے مصنف کی مراد حاکم و محکوم کے درمیان سرد رویے ہیں جو ازل سے یہاں کا وطیرہ ہیں:

"اب ایک عرصے سے شہر کے باسی سرد ہوا کاغذ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔سرد ہوا کی غذائیت ان کے پھٹے ہوئے چہروں سے عیاں ہے۔ان کے ہاتھ اب دعا کے لیے اٹھتے ہیں، نہ ہی بددعا کے لیے،ان کی زبانیں ڈی فریزر میں رکھے ہوئے فروزن میٹ کی صورت میں ڈھل گئی ہیں۔"(۹۹)

مصنف انتظامیہ کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ان عوامل کی نشاندہی کرتے ہیں جو کہ عوام کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔اگر کوئی حکومتی اہلکار اپنے فرض کو احسن طریقے سے سرانجام دینا بھی چاہے تو اس کی راہ میں روڑے اٹکانے والے حکومتی کارندے ہی ہوتے ہیں جو کہ نہیں چاہتے کہ کوئی کام تکمیل تک پہنچ سکے:

''ڈکشنری میں بیوروکریسی کا مطلب جو بھی ہو لیکن کار خیر میں روڑے اٹکانا اور کام کی بلا کسی سفارش یا مالی فائدے کے بغیر پایا تکمیل تک پہنچ جانا دراصل اصطلاح بیوروکریسی کا آسان ترجمہ ہے۔''(۱۰۰)

یہی حکومتی بدانتظامی ملک کی ترقی میں حائل ہو کر مایوس و ناامیدی کی جنم دیتی ہے۔ ملک کے مستقبل کی فکر سے ہر با اختیار آزاد ہے۔ نوجوان نسل کی سوچ بھی منفی رویوں کا شکار ہو چکی ہے۔ نئی نسل کا کوئی منشور، کوئی مقصد ہی نہیں، جس کے تحت وہ خود کو سنبھالا دے سکے اور اپنا کردار ادا کر سکے۔ نئی نسل کا جوان سوچنے پر مجبور ہے۔

''جب وہ انجینئر بنے گا تو سڑکیں بنوائے گا، جو تکمیل سے پہلے ہی ادھڑنے لگیں گی۔ بلند و بالا عمارات تعمیر کروائے گا، جو کام کرتے ہوئے مزدوروں پر ریت کے ڈھیر کی طرح گر پڑیں گی۔ پل بنوائے گا جو معیاد سے پہلے بہت سی بسوں کا بوجھ لیے نیچے بہتے پانیوں میں گم ہو جائیں گے۔''(۱۰۱)

قانون نافذ کرنے والے ادارے اگر صحیح طریقے سے اپنے فرائض کی ادائیگی کو یقینی بنائیں تو آج ملکی حالات یہ نہ ہوں جن سے ملک آج گزر رہا ہے۔ انتظامیہ کا رویہ، عوام سے نفرت آمیز ہے۔ حالانکہ نفرت جرم سے ہونی چاہیے نہ کہ انسان سے۔ انتظامیہ کے بارے میں عوام کی رائے مصنف کے افسانہ " ادھڑی ہوئی سڑک" میں کچھ اس طرح سامنے آتی ہے:

''لوگوں کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں اڑتی ہیں، اور بڑبڑاہٹیں ہونٹوں سے پھسل کر فضا میں بکھر جاتی ہیں۔ سڑک کے کنارے سائیکلوں کی دکان پر سائیکل کے پہیے کو ہتھوڑی سے ٹھوکتا ہوا، ناٹے قد کا موٹا مستری بھاری بوٹوں والے کی ماں بہنوں کو ہوا میں گالیاں اچھال کر زور سے سڑک پر تھوکتا ہے۔''(۱۰۲)

حکومتی بدانتظامی آئے دن ہزاروں جانیں نگل لیتی ہے۔ ہر شعبہ ہائے زندگی انتظامیہ کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہے:

''سامنے ٹی وی کی سکرین پر لئی کے کنارے بنے ہوئے مکانات ایسے ٹوٹ کر پانی میں بہہ رہے ہیں، جیسے وہ اینٹوں کی بجائے کاغذ کے بنے ہوں۔۔۔ مردہ جانوروں کی لاشیں۔ نالہ لئی میں چالیس فٹ تک پانی بہہ رہا ہے۔ ویسے یہ کوئی نئی بات نہ تھی جب بھی باران رحمت ذرا زور دکھاتی ہے، لئی کے ساتھ یہ اب پرانا کھیل

بن چکا ہے۔۔۔ پھر ہر حکومت وقت کے کئی کئی دن بیانات آتے رہتے ۔۔۔
(۱۰۳)"

مصنف صرف بارش کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں حقیقت میں ایسے حالات کے لئے منصوبہ بندی کی جائے۔ نامصائب حالات میں عوام ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پہلے ہی اگر نالہ لئی کی صفائی اور اس کے کنارے آباد کچی آبادی پر پابندی لگائی جاتی اور ایک منصوبہ کے تحت شہر کے پانی کے اخراج کا بندوبست کیا جاتا تو نہ ہی سڑکیں ندی نالوں کا منظر پیش کرتیں اور نہ ہی انسانی جانوں کا ضیاع ہوتا۔ مگر ہر بار عوامی نمائندے صرف دعوے ہی کرتے نظر آتے ہیں، مگر جب حکومت کا حصہ بنتے ہیں تو عوام کے بنیادی مسائل کو یکسر نظر انداز کرتے ہیں۔

حوالہ جات/ حواشی

۱۔ مبین مرزا، اکیسویں صدی میں جدید افسانے کے نقوش، مضمون مشمولہ، ادب سلسلہ پبلیکیشنز، ۲۰۱۵ء، دہلی

۲۔ نجیبہ عارف، ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۹

۳۔ مرزا حامد بیگ، فلیپ، عذاب شہر پناہ، از ڈاکٹر انور زاہدی، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲

۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء ص ۲۵۳

۵۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ، ابلاغ اسلام آباد، ۱۹۹۱ء ص ۱۰۸

۶۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، مندر والی گلی، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء ص ۱۳۸

۷۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، مندر والی گلی، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء ص ۱۴۲

۸۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، مندر والی گلی، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء ص ۱۴۶

۹۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، مندر والی گلی، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء ص ۱۴۷

۱۰۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، جدیدیت کے بعد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۰۵ء ص ۸۵

۱۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء ص ۲۳۳

۱۲۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، ایف۔ڈی پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۹ء ص ۴۷۰

۱۳۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء ص ۹۷

۱۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء ص ۸۵

۱۵۔ اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، جدیدیت اور اردو افسانہ، موڈرن پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۰۱ء ص ۷۔۸

۱۶۔ شہزاد منظر، جدید اردو افسانہ، منظر پبلیکیشنز، کراچی، ۱۹۸۶ء ص ۱۲

۱۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ص ۳۲

۱۸۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء ص ۱۷

۱۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء ص ۲۹۳

۲۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کا افسانوی ادب، عالمین پبلیکیشنز پریس، لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۱۲۸

۲۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کا افسانوی ادب، عالمین پبلیکیشنز پریس، لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۱۳۱۔۱۳۰

۲۲۔رشید امجد،ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ ء ص ۷۷
۲۳۔انور زاہدی،ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ، ابلاغ اسلام آباد، ۱۹۹۱ء ص ۲۱
۲۴۔ایضاً، ص ۳۲
۲۵۔انور زاہدی،ڈاکٹر، مندر والی گلی، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء ص ۲۴
۲۶۔ سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص۔ ۶۱۸
۲۷۔رشید امجد،ڈاکٹر، پاکستانی ادب، رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص۔ ۶۵
۲۸۔رشید امجد،ڈاکٹر، پاکستانی ادب، رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص۔ ۶۹
۲۹۔انور زاہدی،ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۸۹
۳۰۔ سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص۔ ۶۱۴
۳۱۔انور زاہدی،ڈاکٹر، عذابِ شہر پناہ، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء ص ۲۳۲
۳۲۔ شفیق انجم،ڈاکٹر، انور زاہدی کی کہانیاں، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۱۶۶
۳۳۔انور زاہدی،ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۸
۳۴۔انور زاہدی،ڈاکٹر، عذابِ شہر پناہ، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء ص ۱۱۲
۳۵۔ایضاً۔ ص۔ ۲۰
۳۶۔ایضاً۔ ص۔ ۱۱۶
۳۷۔انور زاہدی،ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۸
۳۸۔اقبال آفاقی،ڈاکٹر، اردو افسانہ: فن، ہنر اور متنی تجزیے، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۲ء، ص ۸۷
۳۹۔ محمد حمید شاہد، ادبی تنازعات، مرتبہ، پروفیسر روف امیر، اے آر پرنٹرز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص۔ ۱۸۴
۴۰۔انور زاہدی،ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فلیپ، ڈاکٹر، اے بی اشرف، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۱۳
۴۱۔انور زاہدی،ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۸۶
۴۲۔ سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص۔ ۵۹۶
۴۳۔انور زاہدی،ڈاکٹر، عذابِ شہر پناہ، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء ص ۱۰۵۔
۴۴۔انور زاہدی،ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۲۵
۴۵۔ایضاً۔ ص۔ ۲۶
۴۶۔انور زاہدی،ڈاکٹر، عذابِ شہر پناہ، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء ص ۸۳۔۸۵

۴۷۔ایضاً۔ص۔۹۳
۴۸۔رشید امجد،ڈاکٹر،پاکستانی ادب،رویے اور رجحانات،پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۱۰ء،ص۔۱۷
۴۹۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذابِ شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء ص۔۲۱۱
۵۰۔انور زاہدی،ڈاکٹر،بائسکوپ دن،فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۔۱۱۳
۵۱۔طاہرہ اقبال،ڈاکٹر،پاکستانی اردو افسانہ،سیاسی و تاریخی تناظر میں،فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۵ء ص،۴۱۹
۵۲۔جمیل جالبی،ڈاکٹر،معاصر ادب،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۱ء،ص۔۲۲
۵۳۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذابِ شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۱۸۰
۵۴۔جمیل جالبی،ڈاکٹر،معاصر ادب،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۱ء،ص۔۶۷۔۲۲
۵۵۔انور زاہدی،ڈاکٹر،بائسکوپ دن،فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۔۲۴
۵۶۔انور زاہدی،ڈاکٹر،مندر والی گلی،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۰۸ء،ص۔۱۳
۵۷۔ایضاً۔ص۔۳۰
۵۸۔انور زاہدی،ڈاکٹر،بائسکوپ دن،فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۔۶۳۔۷۱
۵۹۔انور زاہدی،ڈاکٹر،مندر والی گلی،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۰۸ء،ص۔۷۹،۷۴
۶۰۔شفیق انجم،ڈاکٹر،انور زاہدی کی کہانیاں،فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۹ء،ص۔۱۸۷
۶۱۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذابِ شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۱۷۵
۶۲۔ایضاً۔ص۔۲۳۳
۶۳۔ایضاً۔ص۔۱۸
۶۴۔انور زاہدی،ڈاکٹر،مندر والی گلی،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۰۸ء،ص۔۸۵
۶۵۔ایضاً۔ص۔۱۲۹
۶۶۔انور زاہدی،ڈاکٹر،بائسکوپ دن،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۔۸
۶۷۔شفیق انجم،ڈاکٹر،انور زاہدی کی کہانیاں،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۹ء،ص۔۹
۶۸۔انور زاہدی،ڈاکٹر،بائسکوپ دن،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۔۲۳،۱۸
۶۹۔انور زاہدی،ڈاکٹر،بائسکوپ دن،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۔۸۳
۷۰۔انور زاہدی،ڈاکٹر،مندر والی گلی،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۰۸ء،ص۔۹۷
۷۱۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۱۵۵

۷۲۔انور زاہدی،ڈاکٹر،مندر والی گلی،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۰۸ء،ص۔۷

۷۳۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۱۹۳

۷۴۔طاہرہ اقبال،ڈاکٹر،پاکستانی اردو افسانہ،سیاسی و تاریخی تناظر میں،فکشن ہاوس لاہور،۲۰۱۵ء،ص۔۲۷۷

۷۵۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،فلیپ،منشایاد،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۱۴

۷۶۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۳۵

۷۷۔ایضاً،ص۔۷۵

۷۸۔انور زاہدی،ڈاکٹر،مندر والی گلی،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۰۸ء،ص۔۱۲۰

۷۹۔ایضاً،ص۔۱۴۲

۸۰۔انور زاہدی،ڈاکٹر،مندر والی گلی،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۰۸ء،ص۔۱۱۳

۸۱۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۲۱۱،۲۱۰

۸۲۔صبا اکرام،جدید افسانہ چند صورتیں،زین پبلی کیشنز،کراچی،دسمبر ۲۰۰۱ء،ص۔۵۲

۸۳۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۲۲۴

۸۴۔رشید امجد،ڈاکٹر،پاکستانی ادب ۱۹۹۰ء انتخاب نثر،اکادمی ادبیات،پاکستان،۱۹۹۱ء،ص۔۱۶۵

۸۵۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۳۵

۸۶۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۱۶۳

۸۷۔انور زاہدی،ڈاکٹر،موسم جنگ کا،کہانی محبت کی،گورا پبلی کیشنز،اسلام آباد،۱۹۹۷ء۔ص۹۷

۸۸۔شفیق انجم،ڈاکٹر،انور زاہدی کی کہانیاں،فکشنہاؤس،لاہور،۲۰۱۹ء،ص۔۱۹۵

۸۹۔انور زاہدی،ڈاکٹر،بائسکوپ دن،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۔۳۲

۹۰۔انور زاہدی،ڈاکٹر،مندر والی گلی،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۰۸ء،ص۔۵۵

۹۱۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۲۶

۹۲۔محمد حمید شاہد،ادبی تنازعات،حرف اکادمی،راولپنڈی،۲۰۰۰ء،ص۔۱۸۵

۹۳۔انور زاہدی،ڈاکٹر،موسم جنگ کا،کہانی محبت کی،گورا پبلی کیشنز،اسلام آباد،۱۹۹۷ء۔ص۔۱۰۵

۹۴۔ایضاً،ص۔۱۰۷

۹۵۔انور زاہدی،ڈاکٹر،بائسکوپ دن،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۔۱۴۳

۹۶۔صبا اکرام،جدید افسانہ چند صورتیں،زین پبلی کیشنز،کراچی،دسمبر ۲۰۰۱ء،ص۔۹۲

۹۷۔انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۔۲۵۸

۹۸۔انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔۱۱۳

۹۹۔انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۔۷۶

۱۰۰۔انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔۱۵

۱۰۱۔انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۔۱۸

۱۰۲۔ایضاً، ص۔۲۴۷

۱۰۳۔انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۔۱۸

باب سوم: انور زاہدی کی افسانوی نثر کا اسلوب

کسی فن پارے کے لیے اسلوب کی ضرورت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ہر مصنف کا اپنا ایک منفرد اسلوب ہوتا ہے۔ جو دیگر مصنفین سے اسے ممتاز کرتا ہے۔

علمی اردو لغت کے مطابق اسلوب کے معانی ہیں: " اسلوب، طریقہ، ڈھنگ، طرز وضع اور انداز "[۱]

ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق:

> ''اسلوب کے معنی ہیں انگریزی اصطلاح "سٹائل" دراصل لاطینی لفظ''Stilus'' سٹائل سے مشتق ہے۔ جو اس نوکیلے قلم کا نام تھا، جس سے گیلی یا نرم الواح پر کندہ کیا جاتا تھا۔ بعض یونانی محققین کے بموجب یہ یونانی لفظ ''Stylos'' سے ماخوذ ہے۔ اسلوب کے بارے میں اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن اس کی سادہ اور مختصر ترین تعریف کسی شاعر یا نثر نگار کا مخصوص انداز نگارش کی جاسکتی ہے۔''[۲]

اسلوب کسی مصنف کی پہچان اس وقت بنتا ہے جب مصنف اپنے مخصوص پیرائے میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ سید عابد علی عابد اسلوب کی مختلف صفات کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ گروہ بالترتیب اسلوب کی صفات جذباتی، اسلوب کی صفات تخیلی، اور آخر میں مصنف کے اسلوب کی جمالیاتی صفت پر مشتمل ہیں۔ سید عابد علی عابد اسلوب کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے، جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیز ہو جاتا ہے۔''[۳]

علی رفاد فتیحی کے مطابق اسلوب کی تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے:

> ''لفظ اسلوب کا اطلاق عموماً انسان کی انفرادی اور ذاتی خصوصیات سے ہٹ کر اس کے انداز بیان اور اس کے تخلیقی کارناموں پر ہوتا ہے۔ کسی مصنف یا شاعر کے اسلوب کا اندازہ اس کی شخصیت سے زیادہ اس کے تخلیقی کارناموں سے لگایا جاسکتا ہے۔ لہذا اسلوب کو کسی فرد واحد کی خصوصیات کی بجائے اس کے انداز بیان اور اس کے تخلیقی کارناموں کی خصوصیت کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔''[۴]

کسی مصنف کی تخلیقات اس کی فکر کا نچوڑ ہوتی ہیں، مصنف کا علم و آگہی، کثرت مطالعہ، تجربہ، زبان و بیان اور مصنف کا مشاہدہ جب یہ عوامل یک جا ہوتے ہیں تو اسلوب بنتا ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی "اسلوب" کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "اسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ ہے، ادائے مطلب یا خیالات و جذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کو اپنی انفرادی خصوصیات کے مشمول سے وجود میں آتا ہے، اور چونکہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتادِ طبع، فلسفہ حیات اور طرزِ فکر و احساس جیسے عوامل مل جل کر حصہ لیتے ہیں۔"(۵)

مصنف کے تخلیق کیے گئے کسی ایک فن پارے سے اس کے اسلوب کے خصائص کا اندازہ لگانا مشکل امر ہے۔ وقت کے ساتھ نئے فکری زاویے اور ادبی تحریکیں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں جو کہ مصنفین کے اذہان پر اپنے قوی اثرات مرتب کرتی ہیں۔

اسلوب بنیادی طور پر تخلیقی اظہار کا ذریعہ ہے۔ مصنف جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے اس کی یہی کوشش ہوتی ہے، کہ وہ اپنے قارئین تک اپنی فکر کو پہنچا سکے۔ اپنے تجربات کی بنیاد پر اپنے احساسات و جذبات کو تحریری صورت میں سامنے لا سکے۔ مصنف شعوری و غیر شعوری طور پر سعی کرتا ہے کہ تخلیقی اظہار کا وسیلہ اس انداز اور قرینے سے پیش کیا جائے کہ یہ تادیر قاری کے ذہن پر اپنا عکس چھوڑ سکے۔

اسلوب کا تعلق براہِ راست فکر سے ہے۔ مصنف کی فکری تشکیل کے عناصر، کثرت مطالعہ، قوت مشاہدہ، زبان پر دسترس باہم یکجا ہو کر اسلوب مرتب کرتے ہیں:

> "اسلوب کو فکر سے علیحدہ کر کے سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ کیوں کہ بذات خود فکر کا کوئی اسلوب نہیں ہوتا۔ منتخب الفاظ اور ان کا مناسب استعمال ہی اسلوب کو متشکل کرتا ہے یا الفاظ کے استعمال اور انکی ترتیب، خیال کو بامعنی بناتی ہے۔"(۶)

اردو افسانہ نگاری میں مختلف اسالیب اپنائے گئے جو کہ نامور افسانہ نگاروں کی پہچان بنے۔ ہر افسانہ نگار کی یہ خو ہوتی ہے کہ وہ جس کسی موضوع کو بھی ضبط تحریر میں لائے، قاری کو متاثر کرے اور اس کی الگ پہچان کا مظہر بنے۔ انور زاہدی کا تعلق بیسویں صدی کے آخری دور سے ہے۔ ۱۹۹۱ء میں آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ "عذاب شہر پناہ" کے نام سے شائع ہوا۔ بیسویں صدی کی آخری دو دہائیاں افسانہ نگاروں کے لیے خاصی اہمیت کی

حامل تھیں کیونکہ ایک نیا منظر نامہ ادباء کے سامنے تھا۔ جس نے پوری دنیا کے ادب کو متاثر کیا ہے۔ حالات میں تبدیلی اچانک رونما نہیں ہوتی بلکہ برسوں پہلے اس کی علامات سامنے آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اہل نظر بھانپ لیتے ہیں کہ ضرور مستقبل میں کچھ ایسا ہونے جا رہا ہے جو پورے منظر نامے کو بدل ڈالے گا۔

انور زاہدی ایک علمی و ادبی گھرانے سے وابستہ ہیں۔ آپ کا جنم دیس پاکستان ہے مگر عالمی منظر نامے اور یکسر بدلتی صورتحال سے آپ بخوبی آگاہ ہیں۔ آپ پاکستان کے سیاسی و معاشرتی حالات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ آپ نے پاکستان کی سیاسی و معاشرتی صورتحال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان حالات کے اثرات کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ یہ حالات پاکستان میں تخلیق کیے جانے والے ادب پر براہ راست اثرانداز ہوئے۔ آمریت کے ادوار ہوں، جنگ و جدل ہو یا ثقافتی اقدار کا انہدام، یہ سب موضوعات آپ کی قلم کی زد میں رہے۔ آپ کے تخلیقی عہد میں آمریت اور مارشل لاء کے اثرات پر قلم اٹھایا جا رہا تھا۔ آپ کے چاروں طرف مزاحمتی ادب تخلیق کیا جا رہا تھا۔ ادباء مختلف اصناف ادب کے پس پردہ اپنی آواز اٹھا رہے تھے۔ مارشل لاء کے اثرات جس طرح معاشرے کے افراد پر اپنے اثرات مرتب کر رہے تھے، آپ نے بھی ان اثرات کو قبول کیا۔ معاشرے کا جمود، گھٹن، عدم تحفظ آپ کا موضوع بنا۔ آپ نے معاشرے کے افراد کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی۔ اظہار رائے پر پابندی کی وجہ سے آپ کو بھی علامتی انداز اختیار کرنا پڑا۔ عصری جبریت کے پیش نظر اور ایسا کوئی وسیلہ اظہار سامنے نہیں تھا جس کو اپنایا جا سکے۔ یہی وجہ ہے آپ کے پہلے افسانوی مجموعے "عذاب شہر پناہ" کے بیشتر افسانے علامتی پیرائے میں تحریر کیے گئے ہیں۔ مختلف علامتوں اور استعاروں کی مدد سے اپنی فکری جہات کی عکاسی کی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد آپ کی افسانہ نگاری کے موضوعات سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''انور زاہدی کی کہانیاں اپنے عہد کے کرب کا تجریدی اور علامتی اظہار ہیں۔ تیسری دنیا کا فرد جس طرح خارجی اور داخلی سطح پر شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہا ہے، انور زاہدی نے اسے نہ صرف خود محسوس کیا ہے بلکہ اپنی کہانیوں کے ذریعے اسے ایک وسیع کینوس پر پھیلا دیا ہے۔''(۷)

افسانے میں علامت کو کہیں منفی رجحان کے طور پر سمجھا گیا اور کہیں ابلاغ کی ترسیل میں ایک رکاوٹ گردانا گیا۔ اس ضمن میں انتظار حسین علامت اور اس کی اہمیت کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

''ادب میں جذبات کا مقام وہی ہے جو زرخیز زمین کی تہہ میں پانی کا مقام ہوتا ہے۔ انہیں تہوں کی گہرائی میں جذب ہونا چاہیے۔ گہرائی اور گیرائی علامتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ادب میں بھی اور زندگی میں بھی۔''(۸)

i۔ علامتی انداز و علامتی طرز تحریر:۔

علامت کا مفہوم :

شاعری میں علامتوں کے استعمال کے ساتھ اردو نثر نگاری میں بھی علامت کو برتا گیا۔ افسانہ نگاری کے حوالے سے انتظار حسین، انور سجاد، احمد ہمیش، مرزا حامد بیگ، سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر رشید امجد، محمد منشا یاد اور دیگر افسانہ نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں جنہوں نے مختلف علامتوں کا سہارا لے کر اپنے فکری جہات کو اپنے قارئین تک پہنچایا۔ اردو ادب کو ایسے شاہکار افسانے مہیا کیے جو کہ اپنی مثال آپ ہیں۔ علامات کی تعریف و تفہیم مختلف نقادوں نے اپنے اپنے انداز میں کی۔ ڈاکٹر محمد اشرف کمال علامت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''لغوی سطح پر علامت یعنی (Symbol) سے مراد دو چیزوں کو جوڑنا ہے مگر جب دو چیزیں آپس میں جڑتی ہیں تو ایک تیسری شے جنم لیتی ہے، جو کہ نہ صرف ان کے حاصل جمع سے زیادہ ہوتی ہے بلکہ اس سے مختلف بھی ہوتی ہے۔ علامت کا لفظ تمثیل اور استعارہ کے معانی کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ انسان جب سوچتا ہے اس کے ذہن میں مختلف تصویریں ہوتی ہیں۔ انسانی شعور ان تصویروں کو لفظی پیکروں میں ڈھالتا ہے۔''(۹)

علامتیں تخلیق کار کے تخیل اور تخلیقی سرچشموں سے جنم لیتی ہیں۔ یہ اساطیر و مذاہب، تہذیبی و ثقافتی اقدار، سماجی و سیاسی افکار، مظاہر قدرت وغیرہ سے اخذ کی جاتی ہیں۔ یہ مصنف کی فکری جہات کے اظہار کا وسیلہ بنتی ہیں۔ آپ کے ہاں مختلف موسمی کیفیات، انسان کی داخلی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ سماجی و سیاسی فکر کے حامل افسانوی مجموعہ "عذاب شہر پناہ" مختلف علامتوں کا مرقع ہے۔ علامتی طرز احساس اور علامتی اظہار کے مظہر، یہ افسانے مصنف کی سیاسی و سماجی فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ آپ کے اس مجموعے میں شامل بیشتر افسانوں میں تباہ شدہ شہر، تاریکی، دھند، بارش، تعفن زدہ تالاب، وبائی امراض، خاموشی، ویرانہ، سب علامتیں ہیں جو معاشرے کے افراد کی ذہنی سطح کو بیان کرتی ہیں۔

انور زاہدی کے افسانے اپنے اس عہد کی باز یافت ہیں۔ جب آپ اپنی تعلیم سے فارغ ہوئے تو جو خارجی ماحول آپ نے پایا، اسی کے متعلق اپنے احساسات و جذبات کو قلمبند کیا۔ خارج کی سطح پر رونما ہونے والے واقعات براہ راست افراد کی داخلی کیفیات میں تغیر و تبدل کا باعث بنتے ہیں۔ یہ سب علامتیں ان افسانوں میں ظلم، ڈر، تنہائی کا کرب، بے حسی و عدم شناخت، فرد کی بے توقیری کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ا۔ عذاب شہر پناہ:۔

۱۹۶۰ء کے لگ بھگ علامتی افسانے کو فروغ حاصل ہوا۔ اس حوالے سے نمایاں نام انتظار حسین کا سامنے آتا ہے، جنہوں نے عصری بصیرت کو داستانی علامتوں کے ساتھ جوڑا۔

تیسری دنیا کے انسان اور اس کو درپیش مسائل کا سبب مایوسی، انہونی کا خوف، لاشعور میں بسی تنہائی اور تہذیبی اقدار کا انہدام یہی موضوعات مختلف علامتوں کی صورت میں آپ کے افسانوی مجموعے "عذاب شہر پناہ" کا حصہ ہیں۔

ڈاکٹر شفیق انجم اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ""عذاب شہر پناہ" میں شامل اکثر کہانیاں، علامتی انداز میں ان کے احساس اور مشاہدے کی ترجمان ہیں۔ تاہم یہاں علامتیت، استعارہ سازی کے شوق میں نہیں، بلکہ اظہار کے وسیلے کے طور پر سامنے آئی ہے۔"(۱۰)

مصنف نے علامتوں کا استعمال اس انداز میں کیا ہے کہ جس سے افسانے کے ابلاغ اور تفہیم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ آپ علامتوں کا استعمال صرف اپنی فکر اور احساس کے جذبے کو قاری تک پہنچانے کا ایک معتبر ذریعہ بناتے ہیں۔ اس سے نہ صرف تحریر میں خوبصورتی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے بلکہ تحریر ذو معنی اور موثر ثابت ہوئی ہے۔

"آگہی اور دوسرا آدمی" عذاب شہر پناہ کا پہلا افسانہ ہے۔ جس میں "وہ" کا کردار، افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کہانی نوجوان کی آپ بیتی کو جگ بیتی کا درجہ دیتی ہے۔ یہ ظاہری طور پر یہ ایک علامتی افسانہ ہے، جس میں ایک نوجوان ہوسٹل میں رہتے ہوئے اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے ہے۔ مگر معاشرے اور والدین کی طرف سے اس کے کیریئر کا چناؤ اس پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے زندگی سے نالاں نظر آتا ہے۔ محض ڈگری کا حصول اس کے لیے اہم ہے۔ پیشہ ورانہ مہارت، تجربے کا حصول اور اپنے پیشے سے محبت جیسے عناصر اس کے لیے کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ ایک علامتی کہانی ہے مگر اس کے پس منظر میں موجود مصنف

نوجوان نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے، یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ شعبے اور زندگی گزارنے کے لئے والدین کو بچوں کی کسی بھی فیلڈ سے ذہنی ہم آہنگی اور دلچسپی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ جس طرف ان کا ذہنی جھکاؤ اور رغبت ہو، ان کے لئے آسانی پیدا کرنی چاہیے تاکہ وہ زندگی سے محبت اور اور مطمئن زندگی گزار سکیں۔

"کوئی موسم ہو" یہ کہانی بھی علامتی پیرائے میں نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتی ہے۔ جس سے اس کہانی کے مرکزی کردار میاں بیوی مختلف نفسیاتی مسائل کا شکار ہیں۔ وہ اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ افسانے میں جنسی ناآسودگی اور اولاد کا نہ ہونا، تنہائی کے احساس میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ محرومی، تنہائی اور جنسی نا آسودگی انسانی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے:

> ''کھڑکی میں رکھی، شیشے کی صراحی میں سجی منی پلانٹ کی بیل کو مرجھایا دیکھ کر اسے یوں لگتا ہے، جیسے کسی نے اسے جسم کی گہرائیوں میں مسوس لیا ہو۔ اس کی انگلیاں، منی پلانٹ کی بیل کو چھوتے کانپ اٹھتی ہیں۔ جانے کیوں اس تمام مدت میں منی پلانٹ کی بیل کبھی بھی اس کے ہاں نہ لگ سکی۔ جانے کتنے ہی دوسرے پودے موجود تھے لیکن یہ منی پلانٹ جانے کیوں۔۔۔؟''(۱۱)

منی پلانٹ کی بیلیں، کیکٹس کا پودا، سمندر کی تہہ میں غرق شدہ بحری جہاز اور سمندر کے پانیوں میں تیرتے بچے یہ سب علامتوں کے وہ تانے بانے بنے گئے ہیں کہ جس سے کہانی کے کرداروں کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ کہانی کی پوری فضا قاری کو اپنے حصار میں جکڑ لیتی ہے۔ منی پلانٹ کے پودے کو یہاں زندگی کی تازگی کے طور پر اور کیکٹس کے پودے کو ایک صحرا سے تعبیر کیا گیا ہے، کہ زندگی کس قدر بے رونق اور محرومی کا شکار ہے۔

"عذاب شہر پناہ" کا افسانہ "دوسرے سیزر کی موت" بھی ایک علامتی افسانہ ہے، جس میں مصنف ایک کہانی کے پس منظر میں دوسری کہانی کو بیان کرتے ہیں۔ یہ علامتی کہانی بنیادی طور پر جبریت کے موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ آمریت میں پروان چڑھتی جبریت، کہانی کا مرکز و محور ہے۔ اس میں سیزر کی موت علامتی طور پر ذوالفقار علی بھٹو کی موت کا بیان ہے۔ جس کو مصنف نے کمال مہارت سے کہانی کی ایک منفرد شکل دی ہے۔

سیزر، مارک اینٹینی، ٹریفک سگنلز کا بے ربط ہونا، کالے سیاہ پرندوں کے غول کے غول، کانوں کے ڈھیر، کنکروں کی بارش، بھاری بوٹ یہ تمام وہ علامتیں ہیں جو کہ افسانے کے علامتی اظہار کا وسیلہ بنتی ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے وقت کی صورتحال کو مصنف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بغیر کانوں کے لوگ ایک دوسرے سے ٹکراتے پھر رہے ہیں۔ہر طرف بے سمتی نے اور ظلم و بربریت نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے:

> ''ننگا آسمان، پاگل شہر کو بے بسی سے تک رہا ہے۔کانوں کے ہمالیہ پہاڑ کے سامنے مارک اینٹینی بولے جا رہا ہے۔بغیر کانوں والے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔لگتا ہے جیسے کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہا۔''(۱۲)

"سورج مکھی کے پھول" ایک ڈرائنگ ماسٹر کی کہانی ہے۔جو بچوں کو یہ ٹاسک دیتا ہے کہ کاغذ پر سورج مکھی کے پھول بنائیں۔مگر بعد ازاں اسے باہر کھیتوں اور بچوں کی ڈرائنگ میں سورج مکھی کے پھولوں کی بجائے سانپ ہی سانپ نظر آنے لگتے ہیں۔اس افسانے میں چوہوں اور سانپوں کو بطور علامت استعمال کیا گیا ہے ۔سانپ اور چوہوں جیسی علامتوں کو نفرت کے اظہار کے لئے مصنف نے کہانی کے انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈرائنگ ماسٹر کو نہ گھر میں سکون ہے اور نہ ہی زندگی میں سکون میسر ہے:

> ''بس چین کے کچھ لمحات اس اپنے سکول کے ڈرائنگ روم میں ہی ملتے تھے۔جہاں اس کے شاگرد بچے اس کا کہنا مانتے تھے، ورنہ گھر میں تو وہ چوہوں اور بچوں کے درمیان سینڈوچ ہی بنا رہتا تھا۔''(۱۳)

اس افسانے میں شعور کی رو تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔جس میں مصنف نے ڈرائنگ ماسٹر کے شعور اور لاشعور کے مابین تکرار کو موضوع بنایا ہے۔لاشعور میں بسی یہ گھٹن، زندگی سے بیزاری اور افلاس جیسے عناصر کو شعوری سطح پر دکھایا گیا ہے۔پھولوں کا سانپوں میں تحلیل ہو جانا اسی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔

افسانہ "ریل کہانی" مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا نوحہ ہے۔جس میں ریل گاڑی بطور علامت استعمال ہوئی ہے۔پاکستان کا قیام مسلمانوں کی ہجرت، ریل گاڑیوں پر مسلمانوں اور سکھوں کے حملے، سقوط ڈھاکہ کا عظیم سانحہ، پھر وہی مظالم اور ریلوں کا جلاؤ گھیراؤ، ریل کہانی کا موضوع ہے۔جس طرح وقت اور ریل گاڑی مسلسل حرکت میں ہیں، اسی طرح ان کا ذکر مصنف کے لاشعور میں موجود دو عظیم تقسیموں کی طرف اشارہ کی صورت

میں ملتا ہے۔ فلیش بیک تکنیک کے استعمال سے حال سے اچانک ماضی کے دریچوں میں گم ہوتی کہانی، افسانے کے مرکزی کردار "واحد متکلم" کے سفر کی روداد مختلف کرداروں کے ذریعے ایک گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔

"نزدیک ریلوے اسٹیشن سے ریل کی سیٹی کی آواز آتی ہے۔ یہ کمبخت ریل کی سیٹی میرے اعصاب کو دن میں کتنی بار یونہی جھنجھوڑتی ہے۔۔۔ مجھے لگتا ہے، ہر بار خواب دیکھتے ہوئے چونک اٹھتا ہوں۔ تاریخ پھر خود کو دہرا رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے واقعات کی فلم میرے ذہن کی سکرین پر چل رہی ہے۔۔۔ کھانا کھالیں، میری بہو کی آواز تھی۔۔۔"(۱۴)

جبریت کی گھٹن زدہ فضا اور شہر کے رکھوالے ہی جب یہاں کے باسیوں کی زندگی اجیرن کر دیں تو اس وقت معاشرہ نفرتوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے:

"ہاں۔۔۔ لیکن جب سے بھیڑیوں نے شہر کے بڑوں کا تعاون حاصل کر لیا ہے۔ ہماری زمینوں میں پانی کے سوتے سوکھ گئے ہیں۔ بیشتر زمینوں میں پانی ابھر کر سطح زمین پر آ گیا ہے۔۔۔ اور وہاں جہاں قرنوں سے کاشتکاری ہوتی تھی۔۔۔ اب بڑے بڑے جوہڑ بن گئے ہیں اور جوہڑ بھی ایسے پانی کے جس میں نہ کوئی چیز زندہ رہ سکتی ہے اور نہ ہی یہ پانی کسی کام آ سکتا ہے۔ اس لیے شاید ہم مجبور ہو گئے ہیں کہ نفرت کی کھاد سے اپنی زمینوں کو آلودہ کریں۔"(۱۵)

افسانہ "وبا" عصر حاضر کی فضا کی صحیح معنوں میں عکاسی کرتا ہے:

"یہ آخر لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کوئی نظر نہیں آتا۔ جانے کہاں چلے گئے سب۔۔۔؟ گئے کہیں نہیں۔۔۔ گھر میں بند ہو گئے ہیں۔ سنا نہیں ہے آپ نے پہلی بڑی لڑائی کے بعد جب طاعون پھیلا تھا تب بھی لوگ یوں ہی سر جوڑ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ پھر گلی گلی سے بس جنازہ نکلنے شروع ہو گئے تھے اور وہ بھی کچھ اس طرح کے مرنے والوں کو مشکل سے بس ایک یا دو لوگ ہی کندھا دیتے۔ کچھ مرنے والوں کو تو یہ بھی نہ ملا۔ ایسے بد نصیبوں کے مردے کمیٹی کی گاڑی اٹھا کر لے جاتی۔"(۱۶)

"بے چہرہ کہانی" کا مرکزی کردار باہر کی دنیا سے اس قدر بیزار ہے کہ کھلی فضا سے اندھیری بند کوٹھری کو ترجیح دیتا ہے۔ اظہار خیال پر پابندی کی اس رت نے قلم کار سے اس کی زندگی چھین لی ہے:

''یہ کیسا شور سنائی دے رہا ہے۔ یہ تو اسی طرف سے آ رہا ہے۔ شاید کوئی جلوس ہے۔ لیکن لگتا ہے، بہت سے لوگ رو رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے ایک تابوت اٹھا رکھا ہے۔۔۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہ تو سب کے سب بے حد خوش لباس لوگ ہیں اور یہ تو رونے کی بجائے ہنس رہے ہیں بلکہ شاید کچھ تو گا بھی رہے ہیں۔۔۔ کون ہیں یہ لوگ؟ اور یہ تابوت کس کا ہے۔ ہاں یہ تابوت ایک کہانی کار کا ہے۔''(۱۷)

آپ نے اپنے افسانوں میں علامت کا استعمال ضرور کیا مگر ابلاغ کو ملحوظ خاطر رکھا تاکہ قاری جھنجھلاہٹ اور پریشانی کا شکار نہ ہو۔ جدید افسانہ نگاری اور علامت نگاری کے حوالے سے صبا اکرام لکھتے ہیں:

''جدید افسانہ نگار علامت کو زندگی سے متعلق اپنے ویژن اور ابلاغ کی اپنی قوتوں کے درمیان ایک پل کے طور پر استعمال کرتا ہے اور وہ پل بھی ایسا جو تلوار کی دھار سے کم نہیں۔ اس سے گزرنے کے لیے قاری کا بالغ اور حساس ہونا لازمی ہے۔''(۱۸)

جس قدر مصنف کا صاحب علم ہونا معیاری ادب کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح قاری کا بھی باشعور ہونا ضروری ہے، تاکہ وہ مصنف کی بات کی تہہ تک پہنچ سکے۔ مصنف کے افسانوں میں موسموں کا دخل خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ نے مختلف موسمی کیفیات کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ اس حوالے سے " بارش " آپ کا ایک اہم افسانہ ہے جس نے بارش کو بطور علامت برتا گیا ہے۔ بارش میں زمین اپنے اندر چھپے حشرات الارض کو باہر پھینک دیتی ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ کیسی بارش ہے جس نے ہر طرف ناگ ہی ناگ زمین سے باہر پھینک دیئے ہیں:

''بجلی چمکی تو یوں لگا کہ بہت بڑے بڑے اژدھے اور انسان سڑکوں اور گلیوں میں قدم ملا کر چل رہے ہوں۔ یعنی بارش کے موسم نے شہر کے مزاج ہی کو بدل کے رکھ دیا تھا۔''(۱۹)

عصر حاضر کی فضا میں انسانوں کی حیثیت صرف مجسموں کی سی رہ گئی ہے۔ اس معاشرے کے افراد کے چہرے سپاٹ، جذبات و احساسات سے عاری، نہ آنکھیں، نہ ہونٹوں کا کوئی وجود نظر آتا ہے:

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہ سب ڈمیاں ہیں، اس لیے ان کے چہروں کے خدوخال کو ابھارنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ہو۔ یا پھر بدلے ہوئے تمدن میں

چہرے کی شناخت اپنی اہمیت کھو چکی ہو۔میرے خیال میں وہ شخص میرے

چہرے کی اجنبیت تاب نہ لا سکا۔"(۲۰)

مصنف "بے چہرہ کہانی" میں انہی ڈمیوں کو بطور علامت استعمال کرتے ہیں۔ یہاں یہ علامت تہذیب و تمدن میں ایک بڑی تبدیلی کی طرف اشارہ ہے۔افراتفری اور مادیت پرستی کے اس دور میں انسان کی حیثیت ایک ڈمی سے کم نہیں، جس کو خوب صورت پہناوے سے سجایا تو جا سکتا ہے، مگر اس کا وجود بے کار اور بے حس ہونے کے سوا کچھ نہیں۔اس تہذیب و تمدن کی نئی جہت نے انسان کو انسان سے بیگانہ کر دیا۔ بے چہرگی ہر طرف اپنے پر پھیلا چکی ہے۔ یہ معاشرہ ایک ہجوم کی صورت اختیار کر چکا ہے، ناآشنائی کا نقاب اوڑھے یہ ہجوم ہر کسی کو اپنے بہاؤ میں بے وقعت تنکے کی طرح بہائے جا رہا ہے۔ جن قلمکاروں کے ذمہ ، معاشرے کے افراد کے احساسات وجذبات کی ترجمانی کرنا تھا وہ خود کو چھپائے پھر رہے ہیں۔ کہیں وہ خود اس ہجوم کا حصہ نہ بن جائیں۔ "بے چہرہ کہانی" میں مصنف نے تابوت، آئینہ اور لال بیگ جیسے استعاروں کا استعمال، گھٹن اور خارجی جبریت کے حوالے سے کیا ہے۔ پنکھے کی مسلسل گڑ گڑ کو مصنف نے اکتاہٹ کے معنوں میں اور اس افسانے میں داخلی کیفیت کی عکاسی کے تناظر میں استعمال کیا ہے۔داخلی ناآسودگی جس طرح گھٹن اور فرسٹریشن کا باعث بنتی ہے، پنکھے کی گڑ گڑ کی آواز پورے کمرے کی فضا کی بے سکونی اور گھٹن کی عکاسی کرتی ہے۔آپ کے افسانوں میں موسم اندرونی کیفیات کا پتہ دیتے ہیں۔اس حوالے سے منشا یاد لکھتے ہیں:

"ان کی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے کئی بار لگا کہ بہت سی کہانیاں انور زاہدی اور موسم دونوں نے مل کر لکھی ہیں۔انور زاہدی جب خارج کے مناظر دکھاتا ہے تو موسم اندر کی رتوں کے تغیر و تبدل کا احوال کہتا ہے۔ لیکن اکثر پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون چپ ہے اور کون بول رہا ہے۔"(۲۱)

مصنف کے افسانوی ادب میں موسمی کیفیات اصل میں مصنف کی وہ کیفیات ہیں جو کہ خارجی حقائق اور حالات کی صورت میں تغیر کا شکار رہتی ہیں۔ خارجی جبر، گھٹن کو مصنف سخت دھوپ، آندھی یا سرد ہوا کی صورت میں مختلف جگہوں پر مختلف پیرائے میں استعمال کرتے ہیں۔ مصنف نے حبس کے استعارے کو بارہا استعمال کیا ہے۔ یہ حبس وہ سیاسی انتشار ہے جو کہ اس طوفان سے قبل مکمل سکوت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"آندھی اور اوسٹیوسارکوما" میں مصنف اسی حبس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پھر سنا ہے جب حبس اپنی انتہا کو پہنچا تو ایک طوفان اٹھا۔ جس نے آسمان کے بچے
کچھے حصے کو بھی خون سے رنگ دیا۔ یہ ایسا طوفان تھا جس میں عمارتوں اور درختوں
سے زیادہ انسانوں کو نقصان پہنچا تھا اور درختوں کی جگہ انسان اکھڑ گئے تھے۔''(۲۲)

انور زاہدی کے اسلوب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ آپ مختلف استعاروں اور علامتوں کے ذریعے فرد کی داخلی و خارجی سطح کی مختلف تہوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ اظہار کا یہ وسیلہ ایک عام سی بات کو قاری کے ذہن پر ایسا نقش کرتا ہے کہ تادیر قاری کے ذہن میں محفوظ رہتا ہے۔

"عذاب شہر پناہ" میں تعفن زدہ تالاب، پیتل کی طرح تپتا سورج، کیچڑ، شہر پناہ کی اونچی فصیلیں، اندھیری رت، آزادی کی شہزادی، صیاد سب وہ ذیلی علامتیں ہیں جو افسانے کو ذو معنی بناتی ہیں اور فکر کے نئے در وا کرتی ہیں۔

رات اس افسانے میں سیاسی انتشار کی علامت کے طور پر مستعمل ہوئی ہے۔ یہ افسانہ بنیادی طور پر ایک مزاحمتی افسانہ ہے۔ جو کہ جبر کے خلاف مصنف کی کاوشوں کا آئینہ دار ہے۔ صیاد کو ایک آمر سے تشبیہ دے کر مصنف اس ملک کے باسیوں کو تالاب کے خشک ہونے اور مچھلیوں کے انجام سے آگاہ کر رہے ہیں۔ پورا شہر رات کے زیر تسلط ہے اور رات ہے کہ اپنی من مانی سے شہر کے باسیوں کی زندگیاں اجیرن بنا رہی ہے۔ خوف اور گھٹن کے گہرے سائے میں "آزادی کی شہزادی" برسوں سے اس جبر کی قید میں ہے۔

علامتی طرز تحریر سے بیانیہ طرز تحریر یعنی "عذاب شہر پناہ" سے "بائیسکوپ دن" تک کے افسانوی سفر میں مصنف کے اسلوب میں واضع تبدیلی دیکھی جاسکتی ہے۔

"بائسکوپ دن" آپ کا آخری افسانوی مجموعہ ہے، جس میں ماضی کی یاداشتیں، بچپن کے دنوں کا احوال اور اپنی جنم بھومی میں لڑکپن کی یادیں سموئی ہیں۔ ان دنوں کی کھوج اور ماضی سے محبت ان کا خاصہ ہے۔ علامتی افسانے سے بیانیہ طرز تحریر کی طرف مائل ہونے میں آپ کے دوست احباب جن میں اکثریت، عصر حاضر کے ادباء کی ہے، خاص عمل دخل ہے۔ محمد منشایاد، رشید امجد، ممتاز مفتی آپ کے خاص مہربان دوستوں میں سے ہیں۔ ادبی تنظیم "رابطہ" کے ذریعے سے آپ بھی ان کے اس ادبی سفر سے جڑے رہے ہیں۔ ممتاز مفتی سے آپ کے خاندانی مراسم ہیں جو کہ آپ کے والد سید مقصود زاہدی سے آپ تک منتقل ہوئے۔ اس وجہ آپ سے خاصہ قریبی رشتہ ہے۔

انور زاہدی اپنے ایک خاکے میں اپنی افسانہ نگاری پر ممتاز مفتی کے تاثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میری کہانیوں سے انہیں یہ شکایت رہی۔۔۔ یار ڈاکٹر۔۔۔ تو اتنا اچھا لگتا ہے۔ کبھی سیاست سے الگ ہٹ کر بھی لکھ۔۔۔ میں مسکرا کر انہیں دیکھتا اور کہتا۔۔۔ مفتی صاحب آپ کے لیے عورت سے بڑا کوئی اور موضوع ہے۔۔۔ وہ یہ سن کر ہنس پڑتے۔۔۔۔ اب جبکہ وہ نہیں ہیں تو میں یہ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ میری تازہ کہانیوں میں جو ایک تبدیلی رونما ہوئی ہے، اس کے پیچھے مفتی صاحب کی آٹو سجیشن تو کارفرما نہیں۔۔۔ کتنے بڑے استاد تھے مفتی صاحب۔''(۲۳)

سیاست سے دیگر موضوعات کی طرف رغبت دلانے میں ایک بہت بڑا کردار ممتاز مفتی صاحب کی اس سجیشن کا بھی ہے، جس کا ذکر انور زاہدی نے اپنے ایک خاکے "مفتی جی کی باتیں" میں فرمایا ہے۔

ii۔ بیانیہ طرز تحریر :۔

نثری ادب مختلف اسالیب کی مدد سے اظہار خیال کا ذریعہ بنتا ہے۔ بیانیہ طرز تحریر بھی اسلوب کی ایک اہم جزو کے طور پر سامنے آتا ہے۔ محمد حمید شاہد بیانیے کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''کوئی واقعہ بیان ہو رہا ہو، یا منظر نامہ، کوئی مکالمہ ہو یا مختلف زمانوں کے بیچ یادوں اور احساسات کا سلسلہ، جس میں زمانے آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔۔۔ سب نا میاتی وحدت میں ڈھل کر ہی فکشن بن پاتے ہیں اور جوں ہی یہ فکشن بنتے ہیں، سارا متن بیانیہ ہو جاتا ہے۔''(۲۴)

ا۔ موسم جنگ کا، کہانی محبت کی :۔

۱۹۹۱ء میں انور زاہدی نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ شائع کیا۔ بعد ازاں ۱۹۹۷ء میں آپ کا دوسرا افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا۔ پہلے اور دوسرے مجموعے میں ۶ سال کا عرصہ گزرا اور ارتقائی لحاظ سے مختلف تبدیلیوں کا دور بھی کہلایا۔ عالمی و قومی سطح پر مختلف جنگی محاذ آرائیاں، دہشت گردی کے خلاف مختلف کارروائیاں، ان حالات و واقعات کے انسانی نفسیات پر اثرات وہ ٹھوس اور حقیقی سچائیاں تھیں۔ جن کو بطور موضوع "موسم جنگ

کا، کہانی محبت کی "کا حصہ بنایا گیا۔ زندگی کے رومانس سے لبریز کہانیاں تخلیق کرنا، مصنف کی زندگی سے محبت اور ہر قسم کے حالات میں جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ اس حوالے سے مصنف خود لکھتے ہیں:

> ''جنگیں شروع ہوئیں۔۔۔ سن ۱۹۶۵ء کی جنگ کالج کے دنوں میں دیکھی ۔۔۔ پھر سن ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شمولیت کی۔۔۔ لاکھوں جنگی قیدی ہوئے ۔۔۔ موسم جنگ کا، کہانی محبت کی منظر عام پر آئی۔''(۲۵)

اس افسانوی مجموعے میں مصنف نے زندگی کی حقیقت کو موضوع کے طور پر چنا۔ یہاں شامل اکثر کہانیاں ثقافتی و تہذیبی اقدار کا بیانیہ اظہار ہیں۔

بیانیہ طرز تحریر کی عمدہ مثال "پرسے کی گرد میں اٹا سفر"، زندگی کی بے ثباتی کا ایک قصہ ہونے کے ساتھ ساتھ، معاشرتی زندگی کے ان خدوخال کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں محبت، اپنائیت اور احساس انسانی وجود کو کس قدر بامعنی و اہم بناتا ہے:

> ''سب مٹی ہوا جا رہا تھا، اچھا بھائی جان خدا حافظ۔۔۔ میں چلتا ہوں۔۔۔ گاڑی آ گئی ہے۔ آخری ملاقات میں شاہد کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ پتھر بن گئے تھے۔ ہر طرف مٹی اڑ رہی تھی۔ گاڑی تیزی سے پٹریاں بدل رہی تھی۔ کاش اس دن گاڑی نہ آئی ہوتی۔۔۔ کسی نے مجھ سے کہا۔۔ میں آواز کے رخ پر کھڑکی سے باہر منہ نکالے، لائنوں پر پرانی یادوں کے ادھڑے ہوئے کاغذ اڑ رہے تھے۔''(۲۶)

عمدہ بیانیے کی ایک اور مثال "اسٹل لائف" کی صورت میں معاشرے کی لوئر اور مڈل کلاس کو درپیش معاشی مشکلات اور خوابوں کی عدم تکمیل تک پہنچنے کا قصہ ہے۔ بیانیہ کی خوبصورتی اور شاعرانہ فضا، کہانی کو مزید دلکش بنا دیتی ہے۔ ایک طرف ضرورتوں کے پہاڑ، محدود ذرائع آمدن سے احساس کمتری کا احساس، ہر اس فرد کا احوال ہے جو کہ انتہائی کم آمدنی سے گھر چلانے پر مجبور ہے۔ کرداروں اور کہانی کی بنت کے ساتھ ایک محسوساتی لہر، پورے افسانے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے، جس کا اثر تادیر قاری محسوس کرتا ہے۔

انور زاہدی کے ہاں جب بیانیہ، شاعرانہ تخیل کے ساتھ میل کھاتا ہے تو ایک ایسی جمالیاتی فضا کی تشکیل ہوتی ہے جسے افسانے کا تاثر مزید نمایاں ہو کر ابھرتا ہے۔

"موسم جنگ کا، کہانی محبت کی" کا ایک اور افسانہ "مینار سکوت" بھی بیانیہ کی ایک عمدہ مثال ہے تاثر سے بھرپور یہ افسانہ اپنی مثال آپ ہے۔(Tower of silence) کو مصنف نے اس افسانے میں ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ موت سے متعلق اس علامت کو ایک ایسی کہانی سے جوڑا گیا ہے، جس کہانی کے کردار مسلسل تنہائی اور کرب کی فضا میں سانس لیتے رہے ہیں، کہ انہیں مینار سکوت پر چیلوں کی خوراک بننا زیادہ پسند ہے نہ کہ منوں مٹی تلے دفن ہونا۔ داخلی سطح پر یہ افسانہ ایک ایسے احساس کو جنم دیتا ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ کہانی "مسز ڈی سوزا" کی موت سے جڑی ہے مگر ایک ایسی محسوساتی فضا تخلیق کرتی ہے، جس میں ایک پُراسراریت دفن ہے:

> ''فون پر اس سے اکثر بات چیت ہوتی لیکن وہاں جانے کے بعد وہ اپنی گفتگو میں ہمیشہ مجھے مطمئن لگی۔ مگر ایک رات بس وہ سوتے میں مر گئی۔ اس کی خواہش کے مطابق ہم نے اسے "ٹاور آف سائلنس" کے سپرد کر دیا۔ بہرام ڈی سوزا یہ کہہ کر چپ ہو گئے لیکن مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے اٹھا کر مینار سکوت کی بلندی پر تنہا چھوڑ دیا۔''(۲۷)

اسلوب میں روانی آپ کی افسانہ نگاری کی ایک اہم صفت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ الفاظ کا موزوں چناؤ، پیکر تراشی، مناظر فطرت کی تصویر کشی، شاعرانہ فضا آپ کے اسلوب کو روانی بخشنے والے اہم عناصر ہیں۔ ان عناصر کے مناسب استعمال اور زبان و بیان پر دسترس مصنف کے فکری زاویوں کی وضاحت بخوبی کرتی ہے اور آپ کی تحریروں کو پراثر بناتی ہے۔ عام زندگی سے لیے گئے موضوعات کے علاوہ مصنف نے اپنے زمانے کے منفی رجحانات اور رویوں کو بھی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

تہذیبی و اخلاقی اقدار کے زوال پر مصنف کی کڑی تنقید بھی ان کے افسانوں کو عام آدمی کی آواز بناتی ہے، جس میں اصلاح اور امید نو کا ایک الگ ہی رنگ نمایاں ہوتا ہے، جو قاری کو مایوسی و ناامیدی کی دلدل سے بچاتا ہے۔

> ''ایک دم ہونق ہو یار تم۔۔۔امپورٹ ایکسپورٹ سے بھی بھلا دال گلتی ہے۔ میاں آرٹ وارٹ تو بس ایک بہانہ ہے۔ بس یوں سمجھو کہ جیسے کچھ لوگ زکوۃ خیرات، میں تحلیل نفسی کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ اس طرح سے دین و دنیا

دونوں ہی کی بھلائی رہتی ہے۔ بس ایسے ہی آرٹ وارٹ کو بھی ایک علاج سمجھو۔"(۲۸)

"فنکاری" افسانہ بھی بیانیہ طرز تحریر کا عکاس ہے۔اس افسانے میں مصنف معاشرے کے منفی رویوں اور منفی رجحانات پر طنز کرتے ہیں۔اس معاشرے میں راتوں رات امیر ہونے کے خواب، ہی معاشرتی برائیوں کا باعث بنتے ہیں۔

۲۔ مندر والی گلی:۔

"مندر والی گلی" انور زاہدی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ارتقائی مراحل اور نئے منظر نامے کے تغیر و تبدل نے مصنف پر فکر کے نئے در وا کیے۔نئے ادب کے بدلتے رجحانات اور نئے موضوعات سامنے آئے۔زندگی کے تجربات اور حاصلات نے تحریر اور اسلوب کو مزید پختگی بخشی۔عالمی ادب پر گہری نظر اور عصری رجحانات نے مصنف کی تحریروں میں جدت اور مختلف تکنیکوں کے استعمال سے افسانہ نگاری کے کینوس پر مزید دلکش رنگوں کا اضافہ کیا۔مصنف اس بارے میں خود لکھتے ہیں:

"سر کے بالوں میں چاندی چمکنے لگی تو زندگی نے اپنے اور پرت روشن کیے ۔۔۔کہانی کا بھی رنگ بدلا۔کہانی۔۔۔محبت۔۔۔موت اور مابعد الطبیعات جیسے موضوعات در پیش ہوئے۔مندر والی گلی دیکھی۔"(۲۹)

"مندر والی گلی" کے افسانے بھی مصنف نے بیانیہ طرز تحریر کے حامل افسانے ہیں۔محبت کے جذبات کا احوال ہو یا موت کا بیان، آپ کی کہانیاں اور کرداروں کا چناؤ، مکالمے اور شاعرانہ فضا، ایسا امتزاج ہیں جو کہ میعاری افسانہ نگاری کے لیے کسی سند سے کم نہیں۔

"ایک ایکسٹرا کہانی" ایسا افسانہ ہے جو کہ معاشرتی لحاظ سے زندگی کی خواہشات کی تکمیل کے لیے پورے نظام سے بغاوت کرنا، فرد کے لیے لازمی قرار دیتی ہے۔تمام رشتے ناطے چھوڑ کر "میدو" نامی کردار اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے شہر کے اسٹوڈیو کا رخ کرتا ہے مگر یہ سماج اس سے زندگی تک چھین لیتا ہے۔

مصنف نثر نگار ہونے کے ساتھ شاعر بھی ہیں۔ان کی شاعری کا ایک مجموعہ "سنہرے دنوں کی شاعری" بھی منظر عام پر آچکا ہے۔اس کے علاوہ آپ نے بہت سے بین الاقوامی شعراء کے تراجم بھی کیے ہیں۔اسی بنا پر آپ

کی کہانیوں میں بیانیے کے ساتھ ہمیشہ نظم کی کرافٹنگ محسوس کی جاسکتی ہے۔ جس سے افسانوں میں شگفتگی اور تازگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے:

''دیواروں کے سائے میں لگے ہوئے پام اور ڈرائی سینیا کے پودے ۔۔۔ سدا سہاگن، چنبیلی اور بوگن ویلا کی بیلوں کے پھیلے ہوئے جھاڑ اپنی بے بسی کی بجائے کب سے حویلی کی حالت پر گریہ کناں تھے۔۔۔ پودوں کی شاخیں ایسی سوکھی ہوئی تھیں، جیسے کبھی بہار نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا ہو۔ آخری بار جھڑے ہوئے پھولوں کو گرے بھی ایک عرصہ ہو چکا تھا۔''(۳۰)

انور زاہدی کے آخری دو مجموعے خالص بیانیہ طرز تحریر کی عمدہ مثالیں ہیں۔ آپ کے بچپن کے احوال، لڑکپن کا زمانہ، عہد جوانی کالج و یونیورسٹی کے دن، فوج میں شمولیت، بیرون ملک کے مختلف اسفار کا احوال، آپ کے تجربات و مشاہدات، اور زندگی کی تلخ حقیقتوں پر مشتمل افسانے بیانیہ اسلوب کی عکاسی کرتے ہیں۔ "مندر والی گلی"، "غائب از نظر"، "سب جیتے جی کی باتیں ہیں"، "خبر تحیر عشق سن" بیانیہ اسلوب کی مثالیں ہیں، جہاں واقعات کا تسلسل زمان و مکاں کی حدود میں مقید نظر آتا ہے۔ "یہ جنگل کٹنے والا ہے" شعور کی رو کی تکنیک کے تحت تحریر کیا گیا ہے، افسانہ مصنف کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ "یہ جنگل کٹنے والا ہے" کا واحد متکلم خود کلامی کے ذریعے، کبھی حال سے ماضی اور ماضی سے مستقبل کے ذریعے اپنے لاشعور میں چھپے خوف اور عدم تحفظ کا اظہار مختلف خوابوں کے ذریعے کرتا نظر آتا ہے:

''واقعی کل رات کا خواب ہولناک ہی نہیں۔۔۔ ناقابل فہم بھی تھا۔۔۔ میں ایک جلتے ہوئے شہر میں پھر رہا تھا۔۔۔ جو میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ یہاں کے لوگوں کی وضع قطع، ان کا لباس سب کچھ میرے لئے اجنبی تھا۔۔۔ اور پھر یہ تو کوئی لٹا ہوا شہر دکھائی دیتا تھا۔ میرے کانوں میں کوئی سرگوشی کرتا ہے۔ "یہ ہلاکو کا فتح شدہ بغداد ہے۔۔۔؟''(۳۱)

۳۔ بائسکوپ دن:۔

تیرہ افسانوں پر مشتمل انور زاہدی کا یہ آخری افسانوی مجموعہ ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آیا۔ زندگی کی حقیقتوں اور عہد ماضی کی حسین یادوں پر مشتمل یہ مجموعہ بیانیہ طرز تحریر کا حامل مجموعہ ہے۔ "طائر شب" کے علاوہ باقی تمام افسانے بیانیہ طرز تحریر کی عمدہ مثالیں ہیں، جہاں ثقافتی و تہذیبی اقدار اور مصنف کی اپنی زندگی کا احوال

مختلف ذیلی کرداروں کی مدد سے دلکش کہانیوں کا روپ دھارتے ہیں۔ معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے مصنف اس طرح کہانی کو کشید کرتے ہیں کہ قاری ششدر رہ جاتا ہے۔ "پرانے کاغذوں میں "اور "گلیوں میں گم" افسانے فلیش بیک کی تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے مصنف کے تخلیق کردہ عمدہ افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

> ''اس مجموعے میں۔۔۔ "پرانے کاغذوں میں "کئی اعتبار سے اہم افسانہ ہے کہ اس میں اس کے سوانحی نقوش بہت نمایاں ہیں۔ جس میں اس نسل کی نیم ویران زندگی کا احوال ہے۔''(۳۲)

نفسا نفسی کے اس دور میں آج کا انسان، زندگی کی حقیقی خوشیوں سے ناآشنا ہے۔ رشتوں کا تقدس، ایثار و قربانی کے جذبات سے عاری معاشرہ، مصنف کے نزدیک ایک ایسی قید کی مانند ہے جس کو ہم نے خود اپنے لئے ترقی کی آڑ میں چن لیا ہے۔ عصر حاضر میں بہتر سے بہترین کی تلاش نے انسان کو ان رشتوں سے کہیں دور کر دیا ہے جو کہ انسان کی زندگی میں رنگ بھرنے کا باعث ہیں۔ والدین کی وفات کے بعد زندگی کس قدر بے رونق ہو جاتی ہے، مصنف اس کیفیت کا احوال بارہا اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں:

> ''بچوں کو اپنے ماں باپ اس وقت تک بے حد عزیز ہوتے ہیں، جب تک وہ خود کو زمانے کے سرد گرم کے خلاف غیر محفوظ سمجھتے ہیں، لیکن جوں جوں ان میں عدم تحفظ کا احساس بڑھتی ہوئی عمر۔۔۔ نئے رشتوں اور روابط کے باعث بتدریج کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ملازمتوں کے نتیجے میں وہ خود کو معاشی طور پر خود کفیل سمجھنے لگتے ہیں، توں توں ماں باپ سے تعلق کا جذباتی پل کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ تماشا روز ازل سے ہے۔۔۔ پل نے بہر حال کمزور ہونا ہے۔''(۳۳)

ملازمتوں کے نتیجے میں نئی نسل جب خود کو معاشرتی طور پر مستحکم اور خود کفیل سمجھنے لگتی ہے، تب والدین سے تعلق کا جذباتی رشتہ کمزور ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ والدین جو بچوں کے بہتر مستقبل کے لئے دن رات ایک کر دیتے ہیں، اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دیتے ہیں، بچوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے اور ضرورتوں کے لیے اپنا آپ کھو دیتے ہیں۔ اس معاشرے میں ان کی اہمیت تب کم جاتی ہے جب وہ بڑھاپے کو پہنچ جاتے ہیں۔

حالانکہ اس عمر میں ان کو توجہ اور محبت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ بچے والدین کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ آپ ایسی نوجوان نسل کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، جو خود تو کامیابی کا زینہ چڑھنا جانتی ہے مگر

ان کامیابیوں کے پیچھے جو قربانیاں درپردہ موجود ہیں وہ ان کو یکسر فراموش کر دیتی ہے۔ جیسا بویا جائے گا ویسا ہی کاٹنا مقدر بن جائے گا۔

" بائسکوپ دن " میں بیانیہ ان مسائل کے ساتھ اس دور میں ہر فرد کو درپیش معاشی مسائل کی طرف بھی توجہ مبذول کرواتا ہے۔ جس سے عہد حاضر کا انسان گزر رہا ہے۔ غم روزگار، مہنگائی، مسلسل محنت نے انسان کو ایک ایسی دلدل میں دھکیل دیا ہے، جس میں جس قدر ہاتھ پیر چلائے جائیں انسان دھنستا چلا جاتا ہے، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ محنت میں عظمت ہے مگر عصر حاضر میں ایک مسلسل کام کرنے والا شخص مشین بن کر رہ گیا ہے۔ احساس و جذبات سے عاری ایک ایسی مشین جس کا احساس سے دور دور تک کوئی ناطہ نہیں۔ مصنف کا افسانہ " خواب سا دن " بھی ایسی معاشی صورتحال کا عکاس ہے جس میں ایک انسان مسلسل کام کی وجہ سے اس قدر ذہنی تھکن کا شکار ہے کہ اسے اپنا گھر، اپنا خاندان، اپنا سب کچھ اجنبی لگنے لگتا ہے۔ وہ سب اس کے لیے کسی نامعلوم دنیا کے افراد ہوں۔ یہاں کا ماحول اسے اس قدر انجام لگتا ہے کہ وہ یہاں سے فرار چاہتا ہے مگر فرار ممکن نہیں۔ شعور کی رو کی تکنیک کو مصنف نے اس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے کہ کہانی کا " واحد متکلم " حال اور مستقبل کی بھول بھلیوں میں اس قدر کھو چکا ہے اس کا اپنا وجود اس کی پہنچ سے کوسوں دور ہو چکا ہے:

> " لگتا ہے آپ کی طبیعت اتنی خراب ہوئی ہے کہ آپ کو ارد گرد کی کچھ خبر نہیں۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔؟ میں کہاں ہوں۔۔۔؟ یہاں کے مکینوں سے میرا کیا تعلق ہے؟ "(۳۴)

ج۔ منظر نگاری:۔

منظر نگاری انور زاہدی کے اسلوب کا نمایاں جزو ہے۔ آپ کی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور سے آخری مجموعے تک منظر نگاری خارجی حوالے سے ہمیشہ آپ کے افسانوں کا حصہ رہی ہے۔ شاعر ہونے کے ناطے ،لاشعور میں بسی فطرت سے محبت اور لگن آپ کے افسانوں میں رچی بسی ہے۔ آپ کے ہاں خارجی سطح پر مناظر فطرت اور ان کا بیان ،افسانوں میں شاعرانہ تخیل کو پروان چڑھاتے ہیں۔ جو قاری کو اپنے حصار میں جکڑ لیتا ہے۔ قاری خود کو ان مناظر اور فطری حسن کا حصہ تصور کرنے لگتا ہے جو مصنف اپنے قلم سے افسانوں کے کینوس پر رنگ بکھیرتے ہیں۔ کبھی یہ منظر کشی حقیقی مناظر کا بیان ہوتی ہے تو کبھی تخیلاتی سطح پر آپ کے تخیل

کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے۔ منظر نگاری کا براہ راست تعلق مصنف کی بصارت سے ہے۔ اس حوالے سے سید عابد علی عابد لکھتے ہیں :

> ''جذبات ہوں یا افکار، اچھا منظر نگار انہیں تصویروں کی صورت میں دیکھتا ہے اور اس کے لیے وہاں استعارے سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ اس کے ادراک کی تمام قوتیں اور اس کے حواس کی تمام صلاحیتیں گویا بصارت کو اپنا محور بنالیتی ہیں۔ اسی محور پر ہر چیز گھومتی ہے۔''(۳۵)

مصنف کی یہی بصارت قاری کے دیکھنے کی صلاحیت کو بھی تقویت فراہم کرتی ہے۔ بیک وقت نظر کے سامنے، بے شمار مناظر اور تصاویر میں سے اپنی مرضی کے مطابق مناظر کی نشاندہی اور چناؤ میں قاری کو ہمیشہ سہولت رہتی ہے۔ مظاہر فطرت کے بیان سے ذہنی آسودگی اور تازگی کا احساس قاری کے ذہن کو بھی پر سکون اور شگفتگی سے دوچار کرتا ہے:

> ''سڑک سے نیچے، گہرائی میں جھانکنے پر پتہ چلا کے نیچے وادی میں دور پہاڑوں کے دامن میں ایک پیالہ نما جھیل، روشن دن میں، سورج تلے، انگوٹھی میں جڑے ہوئے نگینے کی طرح لش لش کر رہی تھی۔ واہ کس قدر حسین منظر ہے۔''(۳۶)

حقیقی دنیا اور تخیل کی دنیا کا حسین امتزاج مصنف کی تحریروں میں ایک ایسی روح پھونک دیتا ہے، جس سے کہانی کا اسلوب دلکش و دلفریب ہو جاتا ہے۔ اسلوب کی یہی دلکشی، فکری زاویوں کی عکاسی کرتے ہوئے مختلف محسوساتی سطحیں سامنے لاتی ہے۔ ایک باکمال افسانہ نگار منظر کشی کے ذریعے افسانے میں جان ڈال دیتا ہے۔ اسی بنا پر مختلف کرداروں کا احوال، ان کے احساسات و جذبات کی مختلف جہتوں کو آشکارا کرتا ہے۔ مناظر فطرت کا سہارا لے کر اس کا ایک ایسا عکس تیار کرتا ہے جو کہانی کے کرداروں اور جذبات کے مابین ہم آہنگی کا باعث بن کر کہانی میں ربط پیدا کرتا ہے۔

انور زاہدی منظر نگاری کے ذریعے اپنے افسانوں کا پس منظر اس انداز میں تخلیق کرتے ہیں جو کہ ان کے تخلیق کئے گئے کرداروں کی جذباتی کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ آپ کا مشاہدہ، اپنے گرد و پیش سے کہانی کی تلاش اور مختلف کرداروں کا چناؤ کرتا ہے، جو کہ عام انسانی آنکھ کی پہنچ سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ منظر نگاری افسانے میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرتی ہے۔ کسی خیال اور تصور کو متحرک کرنے اور شکل دینے کے لئے مصنف کا منظر کشی کا سہارا لینا اس کے تخلیقی عمل کا ذریعہ بنتا ہے۔

مصنف کے ہاں منظر نگاری مختلف صورتوں میں سامنے آتی ہے۔ فطری اور قدرتی مناظر، تخیلاتی سطح کے مناظر، تہذیبی و ثقافتی مناظر، جنگی و رزمیہ مناظر جابجا بکھرے ہوئے، آپ کے افسانوں کا حصہ ہیں۔ شام کا ایک خوبصورت منظر جو مصنف کے عمیق مشاہدے کی طرف اشارہ کرتا ہے:

''شام آہستہ آہستہ آسمان سے اترتے ہوئے سارے محلے کو اپنے حصار میں لے لیتی۔ مسجد کے ارد گرد موجود درختوں میں بسیرا کرنے والی چڑیاں، دن کے ختم ہونے پر۔۔۔ شور مچانا شروع کر دیتیں۔۔۔ چمگادڑوں کے غول کے غول۔۔۔ اپنے خفیہ ٹھکانوں سے نکل کر محلے بھر کے مکانوں پر پھیلے ہوئے دائروں میں چکر لگانے شروع کر دیتے۔''(۳۷)

آپ کے پہلے افسانوی مجموعے کے افسانے جبریت، سیاسی انتشار، گھٹن اور عدم شناخت جیسے مختلف مناظر پیش کرتے ہیں۔ گھٹن اور عدم تحفظ کی یہ فضا پورے معاشرے پر طاری ہے۔ خوف اور بے یقینی کو مصنف مختلف مناظر کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ اور اپنے کرداروں کو ان مناظر سے اس قدر ہم آہنگ کرتے ہیں کہ قاری اس گھٹن زدہ ماحول میں اپنا دم گھٹتا محسوس کرتا ہے۔ "عذاب شہر پناہ"، "سرنگ"، "دوسرے سیزر کی موت"، "خشک سالی" اور "سرد ہوا" جیسے افسانے ان مناظر کی عکاسی کرتے ہیں۔

تخیلاتی سطح پر حقیقی دنیا سے خیال کا سفر، مصنف کی قوت مشاہدہ اور عصری بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے:

''اس نے اپنے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا چاہا لیکن وہاں سوائے اس کی اپنی تنہائی اور آوازوں کے جنگل کے کچھ نہ تھا۔ صیاد کے سحر سے بچو۔۔۔ اور اپنی خیر مناؤ۔ اس کے کانوں کو ایک آواز پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ بھاگو نہیں تو۔۔۔ تم بھی آوازوں میں ڈھل جاؤ گے۔ ایک آواز چیخی۔۔۔ دیکھو۔۔۔ سورج کا رخ بدل رہا ہے۔''(۳۸)

مصنف کے دوسری افسانوی مجموعے "موسم جنگ کا، کہانی محبت کی' میں رزمیہ اور جنگی مناظر سامنے آتے ہیں۔ مصنف کی جنگ میں شمولیت اور آپ بذات خود جنگ کے حالات کے چشم دید گواہ ہیں۔ اسی بنا پر اس مجموعہ میں شامل افسانوں میں کہیں جنگی منظر اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہیوں اور بربادیوں کے مناظر، ایسی حسیاتی سطح سے جوڑے گئے ہیں جو کہ قاری کے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ یہ تلخیاں انسانی بربریت اور برسوں

سے پروان چڑھتی ہوس کا معتبر حوالہ ہیں۔ خارجی جبر، جنگ و جدل، قتل و غارت گری، تخیل انسانی پر جو اثرات مرتب کرتی ہے وہ سوائے عدم تحفظ اور بے یقینی کی صورت میں سامنے آتا ہے:

''اس جنگ میں سینکڑوں ہلاک، ہزاروں زخمی، ہزارہا معذور اور بے شمار بچے یتیم، ان گنت بیوائیں اور جانے کتنے ہی بے گھر بے سہارا ہو گئے تھے۔ فصلیں تباہ تھیں، بستیاں ویران اور معیشت بیمار ہر طرف زخم، دھواں ہی دھواں، چاروں طرف بارود کی بو، دن روشن ہونے کے باوجود دور، دور تک پھیلے ہوئے جنگ کے ہیبت ناک سناٹے میں سمٹا ہوا تھا۔''(۳۹)

اس منظر میں زندگی کو تہہ و بالا کرنے والی جنگ کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ جنگ صرف جانی نقصان کا باعث ہی نہیں بنتی بلکہ جو زندہ رہ جاتے ہیں اصل مصیبتیں اور پریشانیاں تو ان کے لئے ہوتی ہیں، جو یہ غم سہنے کے لئے جان کنی کے عالم میں ہوتے ہیں۔ تخیلاتی سطح پر مصنف کی منظر نگاری ایسے محسوساتی زاویوں کو ابھارتی ہے جس کی تاثیر اور کرب خود قاری کو اپنی ذات کا کرب محسوس ہونے لگتا ہے۔

"بائسکوپ دن" کا ہر افسانہ مصنف کی قوت مشاہدہ اور اعلی بصیرت کی عکاسی کرتا ہے:

'' بائسکوپ والا جب بھی اپنا طلسماتی صندوق کندھے پر اٹھائے۔۔۔ بغل میں ایک فولڈنگ اسٹول تھامے۔ ایک ہاتھ سے گھنٹی بجاتا ہوا محلے میں داخل ہوتا۔۔۔ اور بائسکوپ والا کی صدا کے ساتھ اس کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ" بارہ من کی دھوبن دیکھو" ۔۔۔ بائسکوپ والا اپنا گیت ہاتھ میں موجود ایک گھنٹی کو بجاتے ہوئے اپنے مخصوص ردھم پر مکمل کرتا۔۔۔ قطب کا مینار دیکھو۔۔۔ باغ شالامار دیکھو۔۔۔ لال قلعہ کی دلّی دیکھو۔۔۔ سمرقند کی بلی دیکھو۔۔۔ کلکتہ کی جوگن دیکھو بارہ من کی دھوبن دیکھو ۔۔۔ جنگل کی بہار دیکھو ۔۔۔ ایک آنے میں یار دیکھو۔۔۔''(۴۰)

انور زاہدی کے افسانوں میں منظر نگاری اپنا اک منفرد مقام رکھتی ہے۔ وہ خارج کو جس آنکھ سے دیکھتے ہیں اس کو من و عن اپنی تحریروں کا حصہ بنا دیتے ہیں اور اس میں روح پھونک دیتے ہیں۔

ڈاکٹر اے بی اشرف اس حوالے سے لکھتے ہیں:

'' انور زاہدی ایمجز کے حسن سے اسلوب کو خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ منظر کشی خوب کرتے ہیں پھر مناظر کو انسانی جذبات اور نفسیات کے ساتھ مربوط کر کے

پیش کر دیتے ہیں۔ اداس فضا کو اجاگر کرنے کے لیے منظر بھی ویسا ہی پینٹ کریں گے۔"(۴۱)

د۔ شاعرانہ تخیل:۔

علمی اردو لغت میں شاعرانہ تخیل کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"شعروں جیسے خیالات، مبالغہ آمیز خیالات، لطیف خیالات۔"(۴۲)

شاعرانہ تخیل کو جاننے سے پہلے "تخیل" کو جاننا ضروری ہے۔ اس کی تعریف "تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات" میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"تخیل ایک ایسی فطری قوت ہے، جو انسان کے شعور اور لاشعور میں مشاہدہ یا تجربہ کی وجہ سے پہلے سے موجود چیزوں کو نئی ترتیب سے جوڑ کر ایک نئی صورت دیتی ہے۔ پھر اس کو تخلیقی عمل سے خوبصورت لفظوں میں ڈھال دیتی ہے، جو سننے والوں کو لطف مہیا کرتی ہے۔"(۴۳)

انور زاہدی کی شخصیت میں رچا بسا تحرک جو آپ کو ہمیشہ اظہار کے لیے بے تاب رکھتا ہے۔ اظہار کے اس قرینے میں شاعرانہ تلازمات اور نثر میں نظم کی کرافٹنگ، آپ کے اسلوب کو دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلوب کی اس خصوصیت کے پس منظر میں آپ کا شاعرانہ تخیل کافی حد تک کارفرما رہتا ہے۔ جذبات و احساسات کی شدت کو ضبط تحریر میں لانے کا اس سے موثر اور معتبر طریقہ مصنف کے نزدیک کوئی اور نہیں۔ تخیل کے بنا تخلیقی عمل ناگزیر ہے۔ سید عابد علی عابد اس بارے میں لکھتے ہیں:

"مشرق اور مغرب کے نکتہ طراز اس بات پر متفق ہیں کہ تخلیق کے عمل میں جو چیز محرک کے طور پر عمل پیرا ہوتی ہے، وہ تخیل ہی ہے، تخیل پیکر تراشتا ہے۔ چیزوں کی علامتیں اور نشان ڈھونڈتا ہے۔"(۴۴)

مصنف کے چاروں افسانوی مجموعوں میں شاعرانہ تخیل افسانوں کی زینت بنتا دکھائی دیتا ہے۔ یہی تخیل افسانوں میں جمالیاتی عنصر کے طور پر ابھرتا چلا جاتا ہے۔ مصنف کے لاشعور میں موجود شاعر، نثر میں بھی شعری وسائل کا اضافہ کرتا ہے۔ جس سے جذبات و احساسات کا اظہار مزید موثر ہو جاتا ہے۔ حقیقی دنیا جب تخیل کی رنگ برنگی دنیا کے ساتھ فکر کے نئے در وا کرتی ہے تو شاعرانہ فضا قاری کے ذہن کو تازگی اور مسرت بخشتی ہے۔

افسانے کی اس شاعرانہ کیفیت کے بارے میں پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''افسانہ کو (Poetic form) کہا جا سکتا ہے۔ اپنی فنی تعمیر اور تاثر میں وہ شاعری کے قریب ہوتا ہے۔ اس کے بیانیہ کے تار و پود میں شعری تمثال اہم رول ادا کرتی ہیں۔ یہ اس اعتبار سے صحیح ہے کہ ادب کی کوئی صنف اپنے آپ میں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار نہیں ہوتی۔ اس کی سرحدیں ادب کی دوسری اصناف سے کہیں نہ کہیں ضرور ملتی ہیں۔''(۴۵)

پیکر تراشی کے ساتھ بیانیہ پر گرفت مصنف کی کہانیوں کا خاصہ ہے۔ حقیقی افسانہ نگار کی یہ خوبی ہے کہ کہانی کے داخلی رومانس کو اس قدر دلفریب اور پر تجسس بناتا ہے کہ قاری اس پر کشش ماحول کا حصہ بنتا جاتا ہے۔ انور زاہدی داخلی رومانس پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے مختلف پرچھائیوں، رنگ برنگی موسمی کیفیات اور آوازوں کو طبیعاتی ٹھوس پن سے اس خوبصورتی سے ملاتے ہیں، جس سے ایک شاعرانہ فضا پوری کہانی پر اپنی گہری چھاپ چھوڑ دیتی ہے۔ یہ شاعرانہ عمل کہانی کی دلکشی اور خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ شاعرانہ تخیل کی ایک مثال افسانہ "کوئی موسم ہو" مصنف کے شاعرانہ مزاج کی عکاسی کرتا ہے:

''سجا سجایا ڈرائنگ روم۔۔۔صاف ستھرے ہلکے سبز رنگ کے مخملی صوفے۔۔۔ سینٹر ٹیبل پر رکھے گلدان میں سفید گلاب کے تازہ پھول۔۔۔ دیوار پر ایک طرف بڑے فریم میں متلاطم سمندر۔۔۔ ایک کونے میں شیلف میں رکھی کتابیں اور۔۔۔ شیلف کے اوپر سنہری فریم میں اس کی شادی کی تصویر۔۔۔ بہت سارا زمانہ ایک دم پر لگا کر پیچھے کی سمت اڑ جاتا ہے۔''(۴۶)

آزاد نظم کے یہ مختصر ٹکڑے جا بجا مصنف کے افسانوں میں نظم کی کرافٹنگ کی عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ سجا سجایا ڈرائنگ روم اپنی معنوی گہرائی کے حوالے سے فکر کی مختلف جہتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس کا ایک پہلو رنگ و خوشبو سے مزین دنیا بھی مراد لی جا سکتی ہے۔ مگر ساتھ ہی دیوار پر لگی سمندر کی تصویر جو کہ طلاطم خیز لہروں کی منظر کشی کا عکس پیش کرتی ہے۔ انسان کی داخلی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔ یہیں سے افسانہ "کوئی موسم ہو" کی پوری کہانی کا ادراک ہو جاتا ہے۔

تنہائی،احساس محرومی، جنسی ناآسودگی جیسی کئی داخلی کیفیات کو مصنف نے کمال مہارت سے چند لفظوں میں پرو دیا ہے۔ کہانی کو ایسا آغاز فراہم کر دیا ہے کہ پورا منظر، کرداروں کے مکالمے، استعارہ سازی سب یکجا ہو کر افسانے کی فضا کو دلفریب اور پر کیف بناتے ہیں۔

ماضی کی یادیں مصنف کی زندگی کا حاصل ہیں۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جو "حال" کی عمارت کو سہارا دیتی اور مضبوط رکھتی ہیں۔ ماضی قریب و بعید کا زمانہ، ہمیشہ مصنف کے حال کا حصہ رہا ہے۔ آپ کے چاروں افسانوی مجموعوں میں آپ کے ماضی کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

> "ہاؤس جاب کا زمانہ۔۔۔ دوستیوں اور محبتوں کا زمانہ، صبح و شام دکھی مریضوں کے مابین، شب و روز کام کرنے کے باوجود مسرت کا ایک احساس، آپس کی چپقلشیں ۔۔۔ چھوٹی بڑی رنجشیں۔ پھر منانے کے بعد کی چائے پارٹیاں۔ وارڈ کے لمبے لمبے برآمدوں میں۔۔۔ گہری ہوتی ہوئی شاموں میں۔۔۔ ستون سے لگ کر ختم نہ ہونے والی باتیں۔۔۔"(۴۷)

ماضی کی یادوں بالخصوص مصنف کے بچپن کا زمانہ، جو ملتان میں گزرا۔ جذبات کی شدت کی بدولت ایسے پیرایہ اظہار اختیار کرتا ہے، جس میں پرانا عہد دوبارہ نظروں کے سامنے پلٹ آتا ہے۔ "بائسکوپ دن" کی کہانیوں میں نثر اور شاعری ساتھ ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ خوبصورت امتزاج تحریر کو جاذب نظر بناتا ہے۔ "طائر شب"، " بائسکوپ دن"، "پرانے کاغذوں میں" اور "رین بسیرا" اس حوالے سے اہم افسانے شمار کیے جا سکتے ہیں۔ بچپن میں شہر ملتان کی وہ گلیاں مصنف کے لاشعور میں اپنی بازگشت سناتی ہیں۔

آپ کے افسانوں میں جہاں یہ خوبصورت امتزاج زندگی کی دلکشی کا حصہ بنتا ہے، وہیں منفی رویوں اور عصری جبریت کو بھی اپنا موضوع بناتا ہے۔ مصنف زندگی کا صرف ایک رخ پیش نہیں کرتے بلکہ زندگی کے تلخ حقائق بھی آپ کی فکر کے پس منظر میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ پورا معاشرہ ایک بے سمتی اور بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "عجب اندھیرا تھا۔۔۔ کوئی دوسرا رنگ نظر ہی نہیں آتا۔۔۔ لگتا ہے پوری کائنات سیاہ رنگ میں سمٹ گئی ہے۔۔۔ اگر یہیں کھڑا رہا تو کون جانے کتنے جگ بیت جائیں۔۔۔ اندھیرے میں بھگدڑ مچ گئی۔۔۔ قطار ٹوٹ گئی، لوگ اندھا دھند بھاگنے لگے اور اندھیرے میں گم ہوتے گئے۔۔۔"(۴۸)

ہ۔اختصار:۔

افسانے کے فنی لوازمات میں سے ایک اہم لوازم اختصار ہے۔افسانہ تاثر کے بغیر کچھ بھی نہیں،اس کی طوالت اتنی ہی ہونی چاہیے کہ تاثر ابھر کر سامنے آسکے۔

علمی اردو لغت کے مطابق اختصار کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''کمی، کوتاہی، گھٹاؤ، قصارت، چھوٹاپن، طوالت کی ضد''۔(۴۹)

کلام میں اختصار کی بہت زیادہ اہمیت ہے جس سے انکار ممکن نہیں اور یہ تحریر میں جاذبیت کے عنصر کو مزید نمایاں کرتا ہے۔اس بارے میں سید عابد علی عابد تحریر کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اختصار جان کلام ہے۔یہ صفت اسلوب بھی مصنف کی خوش خلقی اور اس کی پاسداری کا پتہ دیتی ہے۔قارئین خواہ مخواہ وہ چیزیں پڑھتے جائیں جن کے بغیر گزارا ہو سکتا ہے اور یوں ان کا وقت ضائع ہو۔''(۵۰)

اچھے مصنف کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ بے جا طوالت اور افسانے میں بے تکے واقعات کو چھوڑ کر تحریر کو ضخامت سے بچاتا ہے۔تاکہ قاری اکتاہٹ کا شکار نہ ہو۔جامعیت اور اختصار افسانے کی خوبصورتی کو مزید بڑھاتے ہیں۔اس ضمن میں مجید مضمر لکھتے ہیں:

'' افسانے کا اصل حسن،اس کے اجمال و اختصار اور ارتکاز میں کھلتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ایک اچھا افسانہ تخیل و بصیرت کا کرشمہ ہوتا ہے اور تجربے کی تجسیم بھی شعر کی طرح اس کی بھی دو سطحیں ہو سکتی ہیں یعنی ظاہری اور علامتی۔''(۵۱)

اردو افسانہ ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا داستان سے اپنی جدید ترین شکل میں ہم تک پہنچا ہے۔نئے ادبی رجحانات کی وجہ سے اس میں وقت کے حساب سے تبدیلیاں کی جاتی رہیں۔اس کے مطابق یہ اپنی صورت تبدیل کرتا رہا:

''پچھلی پود کے لکھنے والوں میں یہ رجحان عام تھا کہ وہ کسی خاص مقام اور منظر کی مصوری کرتے وقت یا کسی کردار کا تعارف کراتے ہوئے جزئیات اور تفصیلات سے کام لیتے تھے۔کبھی کبھی یہ تفصیل بے حد خشک اور بدمزہ ہو جاتی تھی۔ پڑھتے ہوئے انہیں اکتاہٹ سی محسوس ہوتی۔آہستہ آہستہ یہ رجحان کم ہوا۔ (۵۲)''

عصری تقاضوں کے مطابق تحریر کی ضخامت اسے بوجھل اور خشک بنانے کا باعث بنتی ہے۔ قلت وقت کی بدولت ان تحریروں کو وہ پذیرائی نہیں ملتی جو کہ طویل اور ضخامت پر مبنی ہوں۔ ان کی نسبت اختصار اور جامعیت کی خصوصیت کی حامل تحریریں دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔

انور زاہدی کے اسلوب کی ایک خصوصیت اختصار ہے۔ جو آپ کے افسانوں کو تاثر سے بھرپور بناتی ہے۔ آپ کے چاروں افسانوی مجموعوں میں اختصار کو اپنایا گیا ہے۔ جہاں صرف ایک فقرہ ہی پوری کہانی کی تفہیم کرتا چلا جاتا ہے۔ "عذاب شہر پناہ" کی بیشتر کہانیاں دو سے تین صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہی صورتحال باقی تین مجموعے کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ "کوئی موسم ہو"، "سورج مکھی کے پھول"، "ریل کہانی"، "خواب کی رات" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اختصار کی ایک عمدہ مثال ملاحظہ ہو:

> ''تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔۔۔ ۱۹۴۷ء کے واقعات کی فلم، میرے ذہن کی سکرین پر چل رہی ہے۔''(۵۳)

افسانہ "ریل کہانی" سے لیا گیا یہ اقتباس سقوط ڈھاکہ کے تناظر کو بیان کرتا ہے۔ تقسیم ہندوستان اور بعدازاں سقوط ڈھاکہ دونوں ایسے عظیم سانحات ہیں، جن میں لاکھوں جانیں قربان ہوئیں۔ ان دونوں واقعات پر بے شمار کتابیں تخلیق کی گئیں۔ بارڈر کے دونوں طرف ان واقعات کو ہر خاص و عام نے اپنا موضوع تحریر بنایا ہے۔ انور زاہدی نے دونوں واقعات کو اس خوبصورتی سے اس افسانے کا حصہ بنایا کہ وحدت تاثر اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ سے ۱۹۴۷ء تک کا سفر مصنف کے تخیل میں بسی سکرین کی دو بنیادی تصویریں ہیں، جن کے پس منظر میں پورے دو عہد اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ پنہاں نظر آتے ہیں۔ اختصار کی یہ خوبی صرف ایک جملے میں پورے دو عہد اپنے اندر سمو لیتی ہے جو کہ مصنف کے فن کی عکاس ہے۔ اختصار کی یہ شگفتگی اور جامعیت کی خوبصورتی "موسم جنگ کا، کہانی محبت کی" کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے:

> ''فصلوں کا، موسموں سے اور موسموں کا انسانی خواہشات سے کتنا گہرا تعلق ہے۔
> بھلا کیا ہوتا اگر سدا ایک سے موسم رہتے۔۔۔ ممکن ہے انسانی خواہشات میں بھی کچھ کمی آجاتی۔''(۵۴)

انسانی خواہشات کا موسموں کے تغیر و تبدل سے گہرا ربط ہے۔ موسمی کیفیات میں تبدیلی سے انسانی خواہشات اور ضروریات جڑی ہوئی ہیں۔ یہ موضوع اپنی جزئیات اور ضخامت کی بنا پر بہت وسعت کا حامل ہے۔ مصنف صرف ایک جملے میں اس پورے موضوع کو سمیٹ دیتے ہیں اور معنوی دبازت قاری پر فکر کے نئے

درواکر دیتی ہے۔انور زاہدی موسم کی مختلف رتوں سے انسان کی داخلی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔آپ کے ہاں بعض جگہوں پر احساسات وجذبات صرف ایک موسمی کیفیت سے تعبیر ملتے ہیں۔مصنف نے عشق کو بھی اپنا موضوع تحریر بنایا ہے۔عشق مجاز سے عشق حقیقی کی منازل تک کا سفر کچھ جملوں کی زینت بن کر دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف بنتا دکھائی دیتا ہے۔یہ فن کی خوبصورتی کم ہی مصنفین کے حصہ میں آئی ہے:

> " ویسے یہ محبت بھی ایک عجیب شے ہے۔۔۔ایک عام سے بے ضرر انسان کو کس قدر توانا بنا دیتی ہے۔۔۔ایک معمولی سی عقل و دانش رکھنے والے کے باطن میں کیسے کیسے گلزار کھلاتی ہے۔مریض عشق کے ہاں بھوک پیاس جیسی بدنی خواہشیں مٹ جاتی ہیں، وہ ذرے میں گل اور قطرے میں دریا دیکھنے کی صلاحیت پا جاتا ہے۔۔۔جب یہ محبت من و تو کی حدوں سے بھی ماورا ہو جاتی ہے تو صوفیوں ،ولیوں اور پیغمبروں کا روپ دھارتی ہے۔"(۵۵)

عشق و محبت اپنے معنوں میں وسعت و گہرائی کا حامل موضوع ہے۔صرف اس ایک لفظ کو بیان کرنے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتب بھی ناکافی تصور ہوں گی۔اندرونی کیفیات میں مخصوص اور تاثر سے بھرپور، کیفیت کو الفاظ کے سمندر سے چھان کر ترتیب دینا مصنف کے اسلوب کا خاص وصف ہے۔

اختصار کے عمدہ نمونے ہمیں " بائسکوپ دن " کی کہانیوں میں بھی جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔یاد ماضی کے یہ ٹکڑے جابجا آپ کی کہانیوں میں بکھرے پڑے ہیں۔" پرانے کاغذوں میں گم " افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "بریف کیس میرے سامنے میز پر کھلے پڑے تھے۔۔۔اور ان میں سے نہ جانے کب، کب کی یادیں باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں۔میز پر بکھرے ہوئے کاغذ، اپوائنٹمنٹ لیٹرز، پے سلپس، بچوں کے ہر عہد کی تصویریں، ابا کے خطوط کے نیلے لفافے، اماں کی دعاؤں بھرے خطوط اور ہمارا نکاح نامہ۔۔۔سب آنسوؤں کی برسات میں بھیگ رہے تھے۔"(۵۶)

پوری زندگی کا احوال کیسے ایک بریف کی زینت بنتا ہے؟اس زندگی کے گزارے گئے شب و روز، مختلف اسناد جب محض پرانے اور بوسیدہ کاغذوں کی حیثیت اختیار کرتے ہیں تب یادوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بے کراں

ہو کر آنکھوں کے کناروں سے چھلکنا شروع ہو جاتا ہے۔ مصنف پوری زندگی کو محض چند جملوں میں پرو دیتے ہیں اور ہر اس عمر رسیدہ شخص کی آواز بن جاتے ہیں جو کہ گاہے بگاہے پرانے بریف کیسوں میں کچھ نہ کچھ ضرور تلاش کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۔ ۸۶

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات، ص۔ ۳۲

۳۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۷۴ء، ص۔ ۴۴

۴۔ علی رفاد فتیحی، ساخت اور اسلوب: نظریہ و تجزیہ، عفیف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۶ء ص۔ ۱۳۱

۵۔ ابو اعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص۔ ۲۶۔۲۷

۶۔ ڈاکٹر صباحت مشتاق، اسلوب اور اس کے تشکیلی عناصر، مشمولہ جنرل آف ریسرچ، اردو، بہاوالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، شمارہ ۲۰۱۲، ۲۲ء، ص۔ ۱۸۳

۷۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ، فلیپ، ڈاکٹر رشید امجد، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۔ ۴

۸۔ انتظار حسین، علامتوں کا زوال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۔ ۵۲۔۵۳

۹۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۔ ۲۰

۱۰۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ: بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ئ، ص۔ ۲۹۷

۱۱۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ،، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۔ ۲۶

۱۲۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ،، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۔ ۳۶

۱۳۔ ایضاً۔۔۔ ص۔ ۵۸

۱۴۔ ایضاً۔۔۔ ص۔ ۶۹، ۶۳

۱۵۔ ایضاً۔۔۔ ص۔ ۴۷

۱۶۔ ایضاً۔۔۔ ص۔ ۹۸

۱۷۔ ایضاً۔۔۔ ص۔ ۱۲۲، ۱۲۱

۱۸۔ صبا اکرام، جدید افسانہ: چند صورتیں، زین پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص۔ ۱۰۰

۱۹۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ،، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۔ ۱۳۰

۲۰۔ ایضاً۔۔۔ ص۔ ۱۱۹

۲۱۔ ایضاً، تعارف منشایاد۔۔۔ ص۔ ۱۰

۲۲۔ ایضاً۔۔۔ ص۔ ۱۴۰

۲۳۔ عکسی مفتی، مہااو کھا مفتی، الفیصل نشتران، آر، آر، پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۔ ۱۵۰
۲۴۔ محمد حمید شاہد، اردو افسانہ : بنیادی مباحث، مشمولہ ،ایم اے فاروقی، افسانے کے مباحث، بک ٹائم ،کراچی، ۲۰۱۷ء، ص۔ ۳۲
۲۵۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، ص، ۸
۲۷۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، موسم جنگ کا، کہانی محبت کی، گورا پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص۔ ۱۱۳
۲۸۔ ایضاً۔۔۔ ص۔ ۱۵۳
۲۹۔ ایضاً۔۔۔ ص۔ ۸۹
۳۰۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۸
۳۱۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، مندر والی گلی، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص۔ ۹۸
۳۲۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، تعارف: ڈاکٹر انوار احمد، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء ص۔ ۹
۳۳۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۱۰۱
۳۴۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۸۸
۳۵۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۷۴ء، ص۔ ۱۸۱
۳۶۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، موسم جنگ کا، کہانی محبت کی، گورا پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص۔ ۱۷
۳۷۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۱۲۱
۳۸۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ،، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۔ ۱۴۰
۳۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، انور زاہدی کی کہانیاں، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۱۸۴
۴۰۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۶۱
۴۱۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فلیپ، ڈاکٹر، اے بی اشرف، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۱۳
۴۲۔ وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۔ ۹۴۴
۴۳۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۔ ۱۵۲
۴۴۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۷۴ء، ص۔ ۲۰۰
۴۵۔ قمر رئیس، پروفیسر، اردو میں بیسوں صدی کا افسانوی ادب، کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص۔ ۱۶۸
۴۶۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، عذاب شہر پناہ،، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۔ ۲۵
۴۷۔ انور زاہدی، ڈاکٹر، موسم جنگ کا، کہانی محبت کی، گورا پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص۔

۴۸۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۱۵۵
۴۹۔وارث سرہندی،علمی اردو لغت،علمی کتاب خانہ،لاہور،۱۹۷۷ء،ص۔۸۶
۵۰۔سید عابد علی عابد،اسلوب،ایجوکیشنل بک ہاوس،علی گڑھ،۱۹۷۴ء،ص۔۱۰۸
۵۱۔مجید مضمر،ڈاکٹر،اردو کا علامتی افسانہ،سٹی پبلشرز،سری نگر،۱۹۹۰ء،ص۔۲۸
۵۲۔سید وقار عظیم،پروفیسر،نیا افسانہ،گنج شکر پریس،لاہور،۲۰۱۸ء،ص۔۲۲۹
۵۳۔انور زاہدی،ڈاکٹر،عذاب شہر پناہ،،ابلاغ،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص۔۶۹
۵۴۔شفیق انجم،ڈاکٹر،انور زاہدی کی کہانیاں،فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۹ء،ص۔۱۹۷
۵۵۔انور زاہدی،ڈاکٹر،مندر والی گلی،دوست پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء ص۔۱۳۰
۵۶۔انور زاہدی،ڈاکٹر،بائسکوپ دن،فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۔۱۰۵

باب چہارم:

مجموعی جائزہ:۔

ہر ادیب اپنے معاشرے کا نباظ اور معالج ہوتا ہے، وہ عام آدمی کی آواز بنتا ہے، اس کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔انور زاہدی اپنے افسانوں میں جہاں اپنے حال کو بیان کرتے ہیں ،وہیں موجودہ صورتحال کا اپنے ماضی سے تقابل بھی کرتے ہیں۔ عصر حاضر کے انسان کو اس موجودہ صورتحال میں کن کن مسائل کا سامنا ہے؟ کیوں آج کا فرد اخلاقی گراوٹ اور اپنی ثقافت سے بیزاری اور اپنی اقدار سے باغی نظر آتا ہے۔ ماضی پرستی، معاشرے کے غریب طبقے کا معاشی استحصال، انہونی کا خوف، زندگی سے نفرت اور اس کا عارضی پن، سیاسی حالات میں عدم استحکام، اظہار رائے پر پابندی، جنگ و جدل، فکر موت ،نفسیاتی الجھاؤ، شعور اور لاشعور کی تکرار، حقیقت میں خواب کا واہمہ ،انتظامیہ اور مقننہ کا کردار اور متفرق موضوعات انور زاہدی کی فکری تشکیل کا باعث بنتے ہیں۔

انور زاہدی نے اپنے قاری تک نئے منظر نامے، مغربی طاقتوں کے عزائم اور اس صورتحال میں بدلتی ہوئی دنیا کے حالات و واقعات کو ماضی کے ہلاکو خان کی تباہ کاریوں سے تشبیہ دے کر واضح کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک آج کے ہلاکو خان کے عزائم کس قدر خطرناک ہیں۔ اس کے اثرات پوری دنیا پر کس قدر اپنے اثرات مرتب کریں گے۔ طاقت اور توانائی کا حصول کیسے عراق اور دیگر ریاستوں میں خون کا بازار گرم کرے گا اور خون کی ندیاں بہیں گی۔افسانہ "یہ جنگل کٹنے والا ہے" اسی تناظر میں تحریر کیا گیا ہے۔عدم تحفظ اور زندگی سے مایوسی کی وجہ سے ،اس معاشرے کے افراد بے اطمینانی کا شکار ہیں۔ عصری تہذیبی تناظر میں، عصر حاضر کا انسان تہذیبی اور ثقافتی اقدار کو بے معنی اور بے مقصد سمجھتا ہے۔

اس حقیقت سے بھی آنکھیں نہیں پھیری جاسکتی ہیں کہ ہمارے ملک کی اس تہذیبی و ثقافتی پسماندگی کی وجہ، ہمارا مروجہ سیاسی نظام ہے جو ہم پر مسلط ہے۔انور زاہدی اسی تہذیبی ورثے کی کھوج میں نظر آتے ہیں جو کہ انفرادی و اجتماعی سطح پر کبھی ہمارا قیمتی اثاثہ تھیں۔ تہذیبی اقدار کا انہدام اور ہماری تہذیبی پسماندگی، مختلف معاشرتی مسائل کے پروان چڑھنے کا باعث بن رہی ہے ۔ فنون لطیفہ ،اخلاق و عادات، قوانین رسوم و رواج ،علوم و فنون ، یہی ہمارا تہذیبی ورثہ ہیں ۔ یہی وہ عناصر ہیں جو کہ ایک ثقافت کو پروان چڑھانے کا باعث بنتے ہیں۔

انور زاہدی ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے ہر دم بدلتی سماجی صورتحال اور اس کے تقاضوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ذہنی غلامی سے اپنے سماج کو بچانے کی کوشش تب ہی کامیاب ہو سکتی ہے کہ جب انسان اپنے ماضی سے جڑا رہے۔ اپنی تہذیب سے محبت، اس معاشرے سے محبت، اپنے ماضی سے محبت آپ کے افسانوں کا خاصہ ہے۔

انور زاہدی نے قیام پاکستان اور اس کے بعد کے حالات کا باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کو درپیش مسائل کا از خود مشاہدہ اور ان کا سامنا بھی کیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد، اس مملکت کو جہاں بیرونی خطرات کا سامنا تھا، وہیں پاکستان کے اندرونی سیاسی حالات میں ابتری اور نوزائیدہ پاکستان کو محرومیوں کا سامنا تھا، ان سب عوامل نے عام آدمی کی فکر کو کافی متاثر کیا۔ ایک سہانا خواب اب تکمیل کو پہنچ چکا تھا مگر خواب کی تعبیر یکسر الٹ ثابت ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد دو دہائیوں تک انتظامی لحاظ سے پاکستان کے سیاسی حالات مسلسل ابتری کا شکار رہے۔ بغیر کسی دستور کے پاکستان کا انتظامی ڈھانچہ، مذہبی اور سیاسی تعصبات کی نذر ہوا، اور کوئی خاطر خواہ تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ بعد ازاں مختلف سیاسی جماعتوں، مذہبی ٹھیکیداروں نے ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دی۔ پے در پے مارشل لاء کا نفاذ پاکستان میں جمہوریت پر مسلط رہا۔ آمریت نے جبر جیسی کیفیت کو جنم دیا، اور عام آدمی سے حق آزادی اظہار رائے بھی چھین لی۔ الغرض پوری فضا ہی تعفن اور گھٹن کی آماجگاہ بن گئی۔

طبقاتی تقسیم، ناانصافیوں اور بربریت کی ان گنت داستانوں کے پس منظر میں ہمیشہ موجود رہتی ہے جو کہ آئے دن اخبارات اور ٹیلی ویژن پر نشر کی جاتی ہیں۔ صاحب حیثیت اور طاقتور کے ہاتھوں مزدور کا استحصال، ہمارے ہاں ایک مستقل رویہ اور رجحان بن چکا ہے۔ "بے انجام کہانی" افسانہ ایسی ہی طبقاتی تقسیم کے حوالے سے ایک نوحہ ہے۔ اس معاشرے اور سماج کی بے حسی کی ایک ایسی تصویر ہے جو کہ ہر مظلوم کی مظلومیت کا عکس پیش کرتی ہے۔ یہ رویہ عدم برداشت کو جنم دیتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس معاشرے میں عدم برداشت کی بنیادی وجہ معاشی و معاشرتی ناانصافیاں اور بے اعتدالیاں ہیں۔ جب قانون طاقتور کی باندی بن جائے۔ صاحب اختیار گروہ محکوم و مظلوم کو صرف اور صرف اطاعت یا صبر و استقامت کا درس دیتے ہوں تو ایسا سماج، ذہنی غلام پیدا کرتا ہے۔ جو قوم اس کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے وہ ذہنی بیمار ہوتی ہے اور اس کا اعلیٰ اقدار سے منحرف ہونا، اچنبھے کی بات نہیں۔ بدعنوانی، بدعملی "کرپشن" ایک ہمہ گیر معانی رکھنے والا لفظ ہے۔ یہ صرف مالیاتی ہیر پھیر سے ہی مترادف نہیں بلکہ اس میں بددیانتی، مفاد پرستی، دھوکہ

دہی، رشوت خوری اور اختیارات کا ناجائز استعمال بھی شامل ہے۔ مصنف کے نزدیک بد عنوانی کا یہ منفی سماجی رویہ، دیمک کی طرح اس معاشرے کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ ہر طرف لوٹ مار اور مفاد پرستی کا بازار گرم ہے۔ انور زاہدی نے بد عنوانی اور مفاد پرستی کو اپنے افسانوں میں شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ کرپشن عصر حاضر میں ایک عالمی مسئلے کے طور پر سامنے آئی ہے۔

ترقی یافتہ قومیں، ترقی پذیر اور پسماندہ قوموں کو اپنے سیاسی و معاشی نظام کے جال میں جکڑ کر اپنے مفادات حاصل کر رہی ہیں۔ ملک کے اندرونی حالات بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ کرپشن مافیا، زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیے ہوئے ہے۔ مصنف کے افسانے "ادھڑی ہوئی سڑک"، "خشک سالی"، "اندھیرے موسموں کا سفر"، "فنکاری"، "ایک اور طوفان" کرپشن جیسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ذخیرہ اندوزی، دھوکہ دہی جیسے مسائل اس معاشرے کے ایسے رستے ناسور ہیں، جن کی غلاظت پورے معاشرے کو آلودہ کر رہی ہے۔ بد عنوان عناصر نے اختیارات پر قبضہ کر رکھا ہے۔ جب ترقی کے تمام راستے عام آدمی کے لیے بند کر دیے جائیں اور نااہل لوگ صاحب اختیار ٹھہریں اور عزت دار کہلائیں تو معاشرے کے ہر فرد کی کوشش ہو گی کہ وہ بھی مفادات کی اس دوڑ کو جیتے اور بد عنوانیوں میں ملوث ہو کر پر ثروت زندگی بسر کرے۔ شارٹ کٹ کی یہ دھن اور بہت سی معاشرتی برائیوں کا باعث بنتی ہے، جن میں ملاوٹ، جنسی بے راہ روی اور فحش و عریانی جیسے گھناؤنے کاروبار عروج پکڑ جاتے ہیں۔ "انتہائے شب"، اور "پس دیوار" افسانے اسی قسم کی سماجی برائیوں کا احوال بیان کرتے ہیں۔

یہی غلاظتیں اور گندگی ہے جس نے تہذیبی قدروں کو اس قدر پامال کیا کہ انسان اپنی ہی عزتوں کو روندتا چلا گیا۔ جنس پرستی، زیادتیوں کے آئے روز واقعات، فحاشی کے اڈے، جسم فروشی سب وہ ناسور ہیں جو اس معاشرے کی بنیادوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر گلی، محلہ اور بازار یہاں تک کہ بیٹھکیں بھی اس تعفن کا شکار ہونے لگیں۔ اور اخلاقی گراوٹ اور فحاشی نے اس پورے سماج کو بدبودار کر دیا ہے۔ انور زاہدی نے اس فضا کو اپنے افسانے "انتہائے شب" میں قلم بند کیا ہے۔

معاشرے کا یہ کھوکھلا پن اور انسانی نفسیات کا مطالعہ، انور زاہدی کے نزدیک بنیادی حیثیت کے حامل موضوعات ہیں۔ نہ صرف انسان بلکہ یہ معاشرہ، اپنے خارجی سطح کے حالات اور ان حالات کے انسانی نفسیات پر اثرات سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ جس قدر خارجی سطح کے حالات بہتر ہوں گے، ان کے اثرات بھی معاشرے کے افراد کے اذہان پر مثبت اثرات مرتب کریں گے۔

سماج کی عمارت ماضی میں موجود معاشرتی قدروں، اخلاق کے اعلی نمونوں، انسانیت کی فلاح و بہبود، اجتماعی مفاد کی انفرادی مفاد پر ترجیح جیسے عظیم ستونوں پر قائم تو ہے مگر مستقبل کی چکاچوند، مادیت پرستی، جدید زندگی کے طور اطوار، خود کو ترقی یافتہ کہلانے کی دھن سب وہ عناصر ہیں، جو اس عمارت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں ۔ معاشرے کا فرد اسی بنا پر عدم شناخت اور بے توقیری کا شکار ہے۔

اس ساری صورتحال میں فرد کے داخل و خارج کے مابین ہونے والے تصادم نے فرسٹریشن کو جنم دیا اور فرد سے اس کی شناخت تک چھین لی۔ بے یقینی اور داخلی ناآسودگی نے فرد کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو منجمد کر دیا۔ فرد کے سوچ سمجھ کر اور مناسب وقت پر مناسب رویہ اختیار کرنے اور اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق زندگی گزارنے کا حق بھی چھین لیا گیا۔

مصنف کا افسانوی ادب اپنے قاری کو یہ درس دیتا ہے کہ زندگی اپنی تہذیب و ثقافت سے جڑے رہنے کا نام ہے۔ معاشرے کا ایک ذمہ دار شہری بننا اور اپنا کردار احسن طریقے سے سرانجام دینا، زندگانی کا نچوڑ ہے۔ زندگی انسان کے اندر احساس، محبت اور خلوص جیسے جذبات کو پروان چڑھاتی ہے۔ عظیم مقصد ہی وہ منبع ہے جو زندگی کو حقیقی معنوں میں زندگی بناتا ہے۔

مصنف کی نظر میں انسانی زندگی کے خارجی حقائق، انسان کی داخلی ناآسودگی کا باعث بنتے ہیں۔ جن میں خواہشات کی عدم تکمیل، نفسیاتی مسائل، معاشی ناآسودگی، فرد کی بے توقیری، معاشی استحصال یہ وہ تمام عوامل ہیں، جو کہ داخلی ناآسودگی کا پیش خیمہ بنتے ہیں اور یہی ناآسودگی زندگی کو بے مقصد اور بوجھل بنا دیتی ہے۔ انسانی طبیعت میں چڑچڑاپن اور محرومیت جنم لیتی ہے۔ معاشرہ جمود اور اخلاقی ابتری کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ انور زاہدی نے مختلف کرداروں کا سہارا لیتے ہوئے اس معاشرے میں فرسٹریشن، انسان کے داخل اور خارج میں معرکہ آرائی، اس معاشرے میں پسے ہوئے فرد کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ جبر، وحشت، خوف، غم و غصہ، محرومی یہ وہ تمام عوامل ہیں جو کہ انسان سے اس کی اپنی پہچان اور مرتبہ چھیننے کا باعث بنتے ہیں۔ انسان کا وجود اس بے حسی، افراتفری اور بے توقیری کی اس دھند میں چھپتا جا رہا ہے۔ یہ دھند انسان کے داخل اور خارج دونوں کو متاثر کرتی چلی جا رہی ہے۔ انسان خود سے اور انسانیت سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر زاہدی کے افسانوں میں موجودہ زمانے کا فرد ان پرانے شہروں اور دیہاتوں کا متلاشی نظر آتا ہے، جہاں ہر طرف صرف مہر، محبت، اپنائیت، خلوص جیسے الفاظ کا بسیرا ہی نہیں تھا، بلکہ ان کی حقیقی شکلیں دیکھی اور

محسوس کی جاسکتی تھیں۔ اپنے آباء کا احوال اور پرانی بھولی بسری یادیں ہی انور زاہدی کا حاصل زندگی ہیں۔ یہی انس اور محبت آپ کے افسانوں میں جابجا نظر آتی ہے۔ آپ جب موجودہ دور کو دیکھتے ہیں تو آپ کے سامنے ماضی کی وہ ثقافتی اقدار آجاتی ہیں جو کہ کبھی ہماری شناخت تھیں، وہ اب مٹنے کے قریب ہیں۔ آپ کو اس بات کا شدت سے احساس ہے ہم جو کل تھے وہ آج نہیں رہے۔ ہماری نئی پیڑھی ان اقدار سے کوسوں دور بھاگتی اور نالاں نظر آتی ہے۔ آپ ترقی کے حامی ہیں اور خود پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ مگر آپ خواہاں ہیں کہ بیتے کل کو ساتھ لے کر چلا جائے، منفی رویوں کو ترک کیا جائے، تاکہ حقیقی معنوں میں احساس کے جذبے کو فروغ حاصل ہو سکے۔

عصر حاضر میں درپیش تنہائی، مایوسی، گھٹن جیسے مسائل میں معاشرے کا فرد خود کو موت کی کیفیت سے نبرد آزما پاتا ہے۔ وہ خود کو نہ زندوں میں شمار کر سکتا ہے نہ ہی مردوں میں اس کو کوئی جگہ ہے۔ یہی فرسٹریشن اور حال سے بیزاری، معاشرے کے افراد میں داخلی ناآسودگی اور اور عدم شناخت کو جنم دینے کا باعث بنتی ہے۔ انور زاہدی اس معاشرتی زوال پذیری اور سیاسی عدم استحکام کو معاشرے کے افراد کی موت گردانتے ہیں۔

حکومتی بد انتظامی بھی آپ کے افسانوں کا ایک اہم موضوع ہے۔ افسانہ "ایک اور طوفان" بھی حکومتی بد انتظامی کے تناظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بارش کی تباہ کاریوں سے متعلق ہے۔ جب جڑواں شہروں یعنی راولپنڈی اور اسلام آباد میں ساون کی بارشوں میں خوب تباہی ہوئی تھی۔ اس افسانے میں مصنف نے شدید بارش کی بدولت ہونے والی تباہ کاریوں کو قلم بند کیا ہے۔ ویسے مصنف کے دیگر کئی افسانوں میں بارش زندگی کی علامت کے طور پر مستعمل ہے، مگر یہاں بارش زندگی کو نگلنے اور مصیبت کے طور پر ظاہر ہوئی ہے۔ اس افسانے میں حکومتی بد انتظامی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ذرا سا ابر رحمت کیا برسا، اس ملک میں بجلی بند، سڑکیں ندی نالوں کا منظر پیش کرتی ہیں۔ یہاں تک کے اندرونی اور بیرونی پروازیں تک رن ویز کے زیر آب آنے کی وجہ سے منسوخ کرنی پڑ جاتی ہیں۔

انور زاہدی کا اسلوب انہیں جدید افسانہ نگار میں ممتاز کرتا ہے۔ بیانیے کے ساتھ آپ نے علامتی اور تجریدی پیرائے میں افسانے بھی تحریر کیے، جو کہ عصری ادب کے ساتھ ہم آہنگ اور وقتی ضرورت بھی تھے۔ آپ کے افسانوں میں علامت صرف تحریر کو جاذب نظر اور موثر بنانے کے لیے استعمال کی گئی، نہ کہ تحریر کو

مبہم اور مشکل بنانے کے لیے مستعمل ہوئی ہے۔شاعرانہ تخیل ،اختصار،منظر نگاری آپ کے اسلوب کے نمایاں خصائص ہیں۔

حال سے اچانک ماضی کے واقعات کا بیان اتنا آسان اور عام فہم نہیں۔اس کے لئے ماضی کی معاشرت ،اس وقت کی تہذیبی اقدار سے آگہی، کرداروں کے مکالموں کا چناؤ، جس میں ماضی کی باس موجود ہو۔ایک زیرک اور اپنے فن میں ماہر مصنف کا کام ہے۔جب بھی آپ اپنے کرداروں کا چناؤ کرتے ہیں، یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھتے ہیں کہ جن حالات اور زمانے کا ذکر اپنی کہانی میں کرتے ہیں،ان کرداروں کی زبان،ان کے مابین تہذیبی رچاؤاوران کی حرکات میں کہیں بھی کمزور پہلو نہیں جھلکتا۔

انور زاہدی کے اسلوب کی نمایاں خوبی ہے کہ موضوع کے مطابق آپ کااسلوب اپنی شکل تبدیل کرتا رہتاہے۔حالات کی ستم ظریفیاں،آمریت کی پابندیاں آپ کے ہاں مزاحمتی رویے کی تشکیل کا باعث بنتی رہیں۔آپ نے مزاحمتی ادب کا باریک بینی سے نہ صرف مطالعہ کیا، بلکہ اپنے ابتدائی دونوں مجموعوں میں مختلف علامتوں کا سہارا لے کر اسے اپنے افسانوں میں جگہ دی۔مصنف نے علامت کو برتا اور قاری کو اس کی پر سراریت میں اپنی فکر سے بھی روشناس کروایا۔

مصنف اپنے تخیل کی مدد سے اپنے قاری کو،ان دیکھی دنیاؤں اور شہروں کااحوال سناتے ہیں،جواپنے عہد کی عصری صورتحال کے تحت اجڑ چکے ہیں۔شہر پناہ کا عذاب اس کرب کی صورت میں ہمارے سامنے میں آتاہے۔آپ کے ہاں صاحب اقتدار طبقے کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیاہے،جن کے ذمہ شہر کی حفاظت تھی،وہ خود ہی شہر پناہ کی فصیل میں نقب لگانے کے درپے ہیں۔ان کی شکلیں اس قدر مسخ ہو چکی ہیں کہ کہیں سے بھی وہ انسان معلوم نہیں ہوتے بلکہ بھیڑیوں کاروپ دھار چکے ہیں۔

"شہر بدر ہمزاد" افسانے میں دو علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ عام شہریوں کو بے ضرر اور ناتواں بھیڑوں سے تشبیہ دی گئی ہے، جبکہ ایک مخصوص طبقہ جو کہ اقتدار اعلی کی ہوس میں رالیں ٹپکاتا نظر آتاہے بھیڑیوں کے روپ میں نظر آتاہے۔کلاک ٹاور پر الٹی دوڑتی سوئیاں، بھیڑیے، تعفن زدہ جوہڑ سب وہ علامتیں ہیں،جواس افسانے کے پس منظر میں متحرک نظر آتی ہیں۔سب کچھ خلاف معمول ہو رہاہے۔یہ افسانہ اپنے بیانیے میں سیاست،سادگی اور علامتی پیرایہ کا حسین امتزاج ہے۔

"وبا" کے عنوان سے مصنف کا یہ افسانہ ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آیا۔لیکن اس کو پڑھتے ہوئے موجودہ حالات میں عالمی وبا(Covid-19)کا خیال ذہن کو گرفت میں لے لیتاہے۔جس طرح اس عالمی وبا نے

لاکھوں انسانوں کی جان لے لی، کسی عظیم سانحے سے کم نہیں ہے۔اس افسانے میں مصنف وبا کے دنوں کا احوال بیان کرتے ہیں اور علامتی طور پر وبا سے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کی عکس بندی کرتے ہیں۔ یہاں وبا سے مراد مصنف کے نزدیک وہ مسائل ہیں جنہوں نے پورے معاشرے کو منجمد کر رکھا ہے۔بے یقینی اور موت کے خوف نے ہر دل کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ جو زندہ ہیں وہ مردوں کی طرح کہیں زیادہ تعفن زدہ فضا میں موت کے منتظر ہیں۔ عوامی افواہوں کی گردش نے ماحول کو مزید پر سرار بنا دیا ہے۔

"بے چہرہ کہانی" بھی ایک علامتی کہانی ہے۔ یہ ایک قلم کار کی کہانی ہے، ظاہری اعتبار سے یہ علامتی پیرایہ زبان کا حامل افسانہ ہے، مگر معنی اور مفہوم کے لحاظ سے اس سماج میں جبر، شدت پسندی، بے چہرگی اور عدم شناخت جیسی لاتعداد، کئی حقیقتوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ معاشرے کا فرد جس قدر خوف اور لایعنیت کا شکار ہے۔اس افسانے کا خاص موضوع ہے۔افسانے کا مرکزی کردار سورج کی روشنی سے خائف ہے۔

سچائیوں کی حقیقت اتنی تلخ ہو کہ براہ راست قلم اٹھانا، موت سے مترادف ہو۔علامت کا سہارا لینا ایک فطری عمل ہے۔انور زاہدی اپنے افسانوں کی پیشکش کے نظام کو اس قدر مربوط اور جامع انداز میں قاری کے سامنے لاتے ہیں، کہ قاری کی قوت متخیلہ خود بخود افسانے کی تہہ میں چھپی گہرائی کو بھانپ لیتی ہے۔آپ کے ہاں واقعات اور مظاہر کے درمیان رشتہ اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ کہیں ذرا برابر بھی جھول نظر نہیں آتی۔

"عذاب شہر پناہ" میں شامل کئی فسانے موسمی کیفیات کے عنوانات سے سامنے آتے ہیں۔ان افسانوں میں "کوئی موسم ہو"، "سرد ہوا"، "بارش"، "آندھی اور اسٹیو سار کوما" جیسے عنوان شامل ہیں۔ موسم انور زاہدی کے افسانوں کا بنیادی اور مضبوط استعارہ ہے۔ یہ موسم، بہار، خزاں، بارش، سردی اور چلچلاتی دھوپ کی مختلف صورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔ مصنف کی عالمی ادب پر گہری نظر ہے۔ کثرت مطالعہ، مشاہدے کی قوت، عصری و سیاسی صورتحال سے آگہی، زبان و بیان پر مکمل گرفت آپ کو دیگر افسانہ نگاروں سے الگ کرتی ہے۔ علامت کے ذریعے کسی جذبے یا احساس کی حقیقت کو بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں۔اس کے لیے مشاہداتی اور محسوساتی نظر کی ضرورت پڑتی ہے۔

"عذاب شہر پناہ" میں شہر کو بطور علامت استعمال کیا گیا ہے۔ خارجی جبر سے پناہ لینے کے لیے مصنف ایک شہر کا رخ کرتا ہے تو ایک عذاب اس کا منتظر ہے۔ یہ علامتی افسانہ مصنف کی محسوساتی سطح اور توانا قوت مشاہدہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

انور زاہدی کی افسانہ نگاری ارتقاءپذیری کے مختلف مراحل طے کرتی ہے۔بدلتے رجحانات اور فکری رویوں میں تبدیلی انور زاہدی کے پہلے دو افسانوی مجموعات "عذاب شہر پناہ" اور "موسم جنگ کا، کہانی محبت کی" کو بعد میں شائع ہونے والے دونوں مجموعوں سے جدا کرتی ہے۔پہلے دونوں افسانوی مجموعوں میں سیاسی موضوعات اپنی پوری آب و تاب سے نظر آتے ہیں۔جن میں آمریت، سیاسی عدم استحکام، جمہوریت کا خاتمہ، سیاسی توڑ پھوڑ ،جلسے جلوسوں کا احوال، پکڑ دھکڑ جیسے موضوعات کی بہتات ہے۔اس کے بر عکس دوسرے افسانوی مجموعے جو بعد میں منظر عام پر آئے،ان موضوعات سے کوسوں دور ہیں۔

"مندر والی گلی" اور "بائسکوپ دن" میں کہانی کا رنگ بدل کر نئے پیرائے میں ہمارے سامنے آتا ہے۔جس میں شفٹنگ کے مسائل، محبت، موت کا ذکر، انہونی کا خوف اور مابعد الطبیعات جیسے موضوعات شامل ہیں۔"عذاب شہر پناہ" علامتی طرز تحریر کا حامل افسانوی مجموعہ ہے۔جس کے موضوعات سماجی و سیاسی نوعیت کے ہیں۔اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں علامتی انداز اور فکری بیداری کے اسلوب کی حامل کہانیاں ہیں۔خارجی سطح پر درپیش مسائل، احساسات و جذبات کی ترجمانی اور معاشرے کے فرد پر عصری حالات کے اثرات یہ سب عوامل، علامتی انداز میں مصنف کے قلم کی زد میں رہے۔عصری جبریت کے پیش نظر بات کو کھلم کھلا بیان کرنا یقیناً ایک مشکل امر تھا۔وقت کی ضرورت اور عصر حاضر میں تخلیق کیے جانے والے ادب کی روش پر چلنا بھی مصنف کے لیے ایک اہم اور ضروری نکتہ تصور کیا جاتا ہے۔

آخری دونوں مجموعات میں بیانیہ طرز تحریر کے تحت، زندگی کی خوبصورتی کو اس احسن انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ قاری مصنف کی تخلیق کردہ جمالیاتی دنیا میں خود کو کھویا ہوا محسوس کرتا ہے۔اسلوب کی جدت کے ساتھ افسانے میں رنگ بھرنا، مصنف کی تحریروں کو دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز بناتا ہے۔اس کے ساتھ فکر کے نئے در وا کرتی بیانیہ طرز تحریر کی حامل یہ کہانیاں، زندگی کی مختلف محرومیوں اور تلخیوں کو بھی اپنا حصہ بناتی ہیں۔موت، یاد ماضی کے حوالے سے اہم واقعات کا بیان، جنگ و جدل کے حالات، محبت کے قصے، اخلاقی اقدار کا انہدام، فکر کے نئے زاویے، شاعرانہ تخیل کے ساتھ انور زاہدی کے افسانہ نگاری کو وہ جمالیاتی سطح فراہم کرتے ہیں، جو کہانی کو پر تاثیر بنانے کے لیے ضروری ہیں۔

"موسم جنگ کا، کہانی محبت کی" کے افسانوں میں انور زاہدی بیانیہ انداز کو اپناتے ہوئے، انسان کے معاشرتی زندگی سے مختلف موضوعات کشید کرتے ہیں۔"پھپھوندی"، "شیشے میں بال آیا"، "سراب" اور "موسم جنگ کا، کہانی محبت کی" بیانیہ طرز تحریر کے عمدہ افسانے ہیں۔جن سے مصنف کی تخیلاتی دنیا، اپنی

جمالیاتی سطح کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے۔ مصنف اپنے عہد اور زندگی کے اس رومانس کو سمجھنے اور لکھنے پر دسترس رکھتے ہیں۔ان کے اسلوب کی رنگارنگی اور روانی قاری کو اکتاہٹ اور بد دل ہونے سے بچاتی ہے۔ کہانی کی بنت، کرداروں کے مکالمے، شاعرانہ تخیل آپ کے افسانوں میں رومانوی رنگ بھر دیتے ہیں۔

آپ کا آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے کا فن اکثر و بیشتر کہانیوں سے جھلکتا نظر آتا ہے۔اکثر افسانوں کا آغاز اپنے ماضی کی یادوں سے یا کسی دور کے ایسے تجربے سے شروع ہوتا ہے، جو بعد ازاں جگ بیتی کا روپ دھارتے ہوئے پورے سماج کی ترجمانی کرنے لگتا ہے۔"مندر والی گلی" کے بیشتر افسانے آپ کے ذاتی تجربات پر مبنی افسانے ہیں۔زندگی کے مختلف تجربات اور واقعات کو کہانی کے ساتھ جوڑ کر کرداروں کی مدد سے ایسے انداز میں پیش کرنا مصنف کے فن کا عکاس ہے۔

"بائسکوپ دن" کی بیشتر کہانیوں میں تہذیبی و ثقافتی مناظر کا عکس بہ نسبت زیادہ دیکھا جا سکتا ہے۔یہ مجموعہ مصنف کی یادوں کا احوال ہے۔ان تہذیبی و ثقافتی اقدار کا مرقع ہے جو کہ عہدِ ماضی کا ذریں دور سمجھا جاتا ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ ان کا سنہری دور ہے۔ مصنف حال کے مناظر کو بیان کرتے ہوئے اچانک ماضی کے دریچوں میں جھانکنے لگتے ہیں۔اس سے ایک ایسا دلکش منظر تخلیق ہوتا ہے جو کہ داخلی کیفیات سے مکمل طور پر وابستہ نظر آتا ہے۔ یہاں منظر اس انداز میں کہانی کے ساتھ ساتھ بدلتا ہوا نظر آتا ہے، جوں جوں کہانی کے واقعات تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔"گلیوں میں گم"، "رین بسیرا"، "بائسکوپ دن"، "زحال مستی" میں مصنف حال سے ماضی کے مناظر کی جزئیات کو باہم ملا کر ایسے قرینے سے بیان کرتے ہیں ہر کسی کا اپنا الگ رنگ اور وجود برقرار رہتا ہے۔

ب۔ نتائج:

۱۔ انور زاہدی کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلو جو انہیں دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتے ہیں انہی میں سے ایک پہلو آپ کے موضوعات کا چناؤ ہے۔ زندگی کے مختلف حقائق، عصری آگہی، مختلف سماجی رویے اور مختلف داخلی کیفیات کے خارجی زندگی پر اثرات، مصنف کے ہاں موضوعات کے تنوع کی عکاسی کرتے ہیں۔

۲۔ انور زاہدی کے افسانوں کا یہ خاصہ ہے کہ ان کے پس منظر میں موجود کرب کی کیفیت، عصر حاضر کے اس معاشرتی زوال اور سماجی گراوٹ پر نوحہ کناں نظر آتی ہے۔ ناآسودگی کی اس دلدل میں پھنسا آج کا فرد، آپ کے افسانوں کا مرکز ہے۔ آپ کے افسانوں میں مختلف کرداروں کے ہاں پائی جانے والی ناآسودگی کی یہ کیفیت مختلف سماجی و معاشرتی مسائل سے پردے اٹھاتی ہے۔

۳۔ عصر حاضر کی افراتفری اور مادیت پرستی کی دھن میں ماضی کی بازیافت ہی وہ واحد سہارا ہے جو آپ کو اس عصری تناظر میں جینے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ اپنے ماضی سے گہرا لگاؤ ہی وہ بنیادی محرک ہے جو آپ کے افسانوں میں جابجا ناسٹلجیائی عناصر کی موجودگی کی وجہ بنتا ہے۔

۴۔ آپ کہانی لکھنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔ عالمی ادب پر گہری نظر اور جدید بدلتے ادبی رجحانات سے بخوبی آشنا ہیں۔

۵۔ بحیثیت معالج، آپ کی حساس طبیعت معاشرے کے افراد کے ان مسائل کا احاطہ کرتی ہے جو کہ دیگر مصنفین کی نظر میں وہ اہمیت نہیں رکھتے کہ جن پر قلم اٹھایا جائے۔ آپ کے زیادہ تر افسانے اپنی پریکٹس کے دوران مختلف تجربات سے کشید کی گئی کہانیوں اور آپ بیتیوں پر مشتمل ہیں ۔آپ، آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے میں کمال رکھتے ہیں۔

۶۔ آپ کے افسانوں کا اسلوب، آپ کے عہد کا عکاس ہے۔ آپ کا اسلوب علامتی طرز تحریر اور بیانیہ طرز تحریر کا حسین امتزاج ہے۔

۷۔ آپ کا اسلوب عصر حاضر کے اثرات کے تحت ارتقاء پذیر ہے۔ آمریت کے ادوار میں نیم مزاحمتی ادب اور علامتوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ اکیسویں صدی میں سامنے آنے والے دونوں افسانوی مجموعے بیانیہ طرز تحریر کے حامل افسانے خاصی اہمیت کے حامل ہیں جو کہ معیاری ادب کی عمدہ مثالیں ہیں۔

۸۔ پاکستان کے خراب سیاسی حالات، معاشی عدم استحکام، تعصب، جنگ و جدل، جنگوں کی حشر سامانیاں، دہشت گردی، آمریت کے مختلف ادوار، سماجی مسائل، یہ سب عوامل آپ جیسے حساس طبع ادیب کے اسلوب پر خاطر خواہ اثرات مرتب کرتے ہیں۔

۹۔ "موسم" آپ کے افسانوں میں ایک بنیادی استعارے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مختلف موسمی کیفیات انسان کی داخلی کیفیات کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔ بات جانے پہچانے منظر نامے سے شروع ہوتی ہے اور انجانی منزلوں کی طرف نکل جاتی ہے، صرف باشعور قاری ہی کہانی کی معنویت سے آشنائی حاصل کرتا ہے۔

۱۰۔ شاعرانہ طبیعت بھی انور زاہدی کے اسلوب پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ احساس سے بھرپور اور حساس شخصیت کے مالک انور زاہدی کے افسانے تہذیبی تاثر سے بھرپور جمالیاتی فضا کے حامل افسانے ہیں۔

۱۱۔ منظر کشی اور اختصار آپ کے افسانوی اسلوب کی نمایاں خصائص ہیں۔ یہ دونوں خصائص تحریر کو مزید دلکش اور پر تاثیر بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ج۔ سفارشات:

انور زاہدی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں آپ کے چاروں افسانوی مجموعوں کو شامل کیا گیا ہے۔ جن میں آپ کی فکر کا مطالعہ اور اسلوب کی نمایاں خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ افسانوں کے علاوہ بحیثیت شاعر آپ ادبی حلقوں میں خاصی مقبولیت رکھتے ہیں۔ "سنہرے دنوں کی شاعری" آپ کا شعری مجموعہ ہے۔ آپ کی شاعری پر بھی کام ہونا چاہیے جو کہ تحقیقی و تنقیدی اعتبار سے خاصی اہمیت کا حامل کام تصور ہو گا۔

۲۔ آپ کے ہاں یاد ماضی کافی متحرک اور مضبوط موضوع کے طور پر سامنے آتا ہے۔ چاروں افسانوی مجموعات میں ناسٹلجیائی عناصر کا وجود ایک لازم عنصر کے طور پر ابھرتا ہے۔ یاد ماضی کے حوالے سے بھی اس موضوع پر کام توجہ کا طالب ہے۔

۳۔ آپ کی عالمی ادب پر گہری نظر ہے۔ عالمی شہرت یافتہ ادباء کے کلام کے تراجم بھی آپ کی ادبی سرگرمیوں کا حصہ ہیں۔ جو کہ آپ کی شخصیت کا اہم ادبی کارنامہ ہے۔ انور زاہدی بحیثیت مترجم، ایک اہم موضوع بھی تحقیق طلب موضوع ہے جو کہ اردو ادب کے لئے ایک گراں قدر خزانہ سے کم نہیں۔

۴۔ نثری ادب میں آپ کا ایک سفر نامہ "دنیا کہیں جسے" اور اپنے والد محترم سید مقصود زاہدی پر مرتب کی گئے خاکوں پر مشتمل کتاب "سید مقصود زاہدی: شخصیت اور فن" بھی ادبی فن پارے ہیں۔ یہ کتب بھی خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان پر بھی تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذات:

۱۔انور زاہدی، ڈاکٹر، عذابِ شہر پناہ، ابلاغ، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

۲۔انور زاہدی، ڈاکٹر، موسم جنگ کا، کہانی محبت کی، گورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۷ء

۳۔انور زاہدی، ڈاکٹر، مندر والی گلی، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

۴۔انور زاہدی، ڈاکٹر، بائسکوپ دن، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۳ء

۵۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، انوار زاہدی کی کہانیاں، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۹ء

ثانوی ماخذات:

۱۔انتظار حسین، علامتوں کا زوال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء

۲۔ابو اعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء

۳۔اقبال آفاقی، ڈاکٹر، اردو افسانہ: فن، ہنر اور متنی تجزیے، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۲ء

۴۔انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان

۵۔انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۶۔انور زاہدی، ڈاکٹر، سید مقصود زاہدی شخصیت اور فن، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

۷۔ایم وائی خان، ہمارے سماجی رویے، کرن ریسرچ اینڈ ایجوکیشن فاونڈیشن، واہ کینٹ، ۲۰۰۳ء

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، باراول، مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۴ء

۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

۱۰۔رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰

۱۱۔رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب ۱۹۹۰ء انتخاب نثر، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۱۹۹۱ء

۱۲۔رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی اردو ادب

۱۳۔رشید امجد، ڈاکٹر، مزاحمتی ادب، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۲۰۰۹ء

۱۴۔رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب: رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

۱۵۔سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، آٹھواں ایڈیشن، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۹ء

۱۶۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۰ء

۱۷۔سید عابد علی عابد،اسلوب،ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ،۱۹۷۴ء
۱۸۔سید عابد علی عابد،اسلوب،ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ،۱۹۷۴ء
۱۹۔سید وقار عظیم،پروفیسر، نیاافسانہ،گنج شکر پریس،لاہور،۲۰۱۸ء
۲۰۔شفیق انجم،ڈاکٹر،انور زاہدی کی کہانیاں، فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۹ء
۲۱۔شفیق انجم،ڈاکٹر،اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں،پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۱۰ء
۲۲۔شہزاد منظر،جدید اردو افسانہ،منظر پبلیکیشنز، کراچی،۱۹۸۶ء
۲۳۔صبا اکرام،اردو افسانہ چند صورتیں،زین پبلی کیشنز، کراچی،۲۰۰۱ء
۲۴۔طاہرہ اقبال،ڈاکٹر،پاکستانی اردو افسانہ سیاسی وتاریخی تناظر میں، فکشن ہاوس،لاہور،۲۰
۲۵۔عکسی مفتی،مہااوکھا مفتی،الفیصل نشتران، آر، آر،پرنٹرز،لاہور،۲۰۰۸ء
۲۶۔علی رفاد فتیحی،ساخت اور اسلوب: نظریہ و تجزیہ،عفیف پرنٹرس،دہلی،۲۰۱۶ء
۲۷۔فردوس انور قاضی،ڈاکٹر،اردو افسانہ نگاری کے رجحانات،ایف۔ڈی پرنٹرز،لاہور،۱۹۹۹ء
۲۸۔فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اردو کا افسانوی ادب،عالمین پبلیکیشنز پریس،لاہور،۱۹۸۸ء
۲۹۔فوزیہ اسلم،ڈاکٹر،اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات،پورب اکیڈمی،اسلام آباد،۲۰۱۰ء
۳۰۔قمر رئیس،پروفیسر،اردو میں بیسوں صدی کا افسانوی ادب،کاک آفسیٹ پرنٹرس،دہلی،۲۰۰۴ء،ص۔۱۶۸
۳۱۔مبارک علی،ڈاکٹر،تاریخ کے نئے زاویے،تاریخ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء
۳۲۔مبارک علی،ڈاکٹر،تاریخ کے نئے زاویے،تاریخ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء
۳۳۔مجید مضمر،ڈاکٹر،اردو کا علامتی افسانہ، سٹی پبلشرز، سری نگر،۱۹۹۰ء،
۳۴۔محمد اشرف کمال،ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور ادبی اصطلاحات،بی پی ایچ پرنٹرز لاہور،۲۰۱۶ء،
۳۵۔محمد حمید شاہد،ادبی تنازعات، مرتبہ،پروفیسر روف امیر،اے آر پرنٹرز،اسلام آباد،۲۰۰۰ء،
۳۶۔مرزا حامد بیگ،ڈاکٹر،افسانے کا منظر نامہ، مکتبہ عالیہ،لاہور،۱۹۹۷ء
۳۷۔ممتاز مفتی،اوکھے اولڑے،فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ،راولپنڈی،۱۹۹۵ء،
۳۸۔نجیبہ عارف،۹/۱۱اور پاکستانی اردو افسانہ،پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۱۱ء،
۳۹۔وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتب خانہ،لاہور،۲۰۰۳ء،

انٹرویوز:

۴۰۔ https://www.youtube.com/watch?v=xAdxsaxklOg .

۴۱۔ https://www.youtube.com/watch?v=GZwhRC4DBQM

۴۲۔ https://www.youtube.com/watch?v=I5fKDhkVZmM&t=36s .

۴۳۔ ڈاکٹر انور زاہدی سے مقالہ نگار کا انٹرویو، بذریعہ ملاقات، مکان نمبر 380، سٹریٹ نمبر 34، F-11/2، اسلام آباد، مورخہ 16 ستمبر 2021ء، بروز جمعرات

ضمیمہ جات

مقالہ نگار کا مصنف سے انٹرویو

مقالہ نگار : ڈاکٹر صاحب آپ ادبی حلقے میں انور زاہدی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں، بحیثیت مترجم ، افسانہ نگار ، شاعر اپنی پہچان رکھتے ہیں۔آپ کا حقیقی نام کیا ہے اور شاعری میں تخلص کیا استعمال کرتے ہیں؟

مصنف: میرا حقیقی نام سید انور مقصود زاہدی ہے۔میرے والد محترم کا نام سید مقصود زاہدی ہے اور شاعری میں "انورؔ" تخلص کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔

مقالہ نگار: ا ب تک آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کس کس نوعیت کی ہیں ؟

مصنف: شاعری

سنہرے دنوں کی شاعری۔۔۔۔1984ء

اُردو افسانہ

1. عذاب شہر پناہ۔۔۔۔۔۔1991 ء
2. موسم جنگ کا کہانی محبت کی۔۔۔۔1997ء
3. مندر والی گلی۔۔۔۔۔2007ء
4. بائسکوپ دن۔۔۔۔2013ء

تحقیق و ترجمہ

دریچوں میں ہوا..... 1982ء

(جدید ایرانی شاعری کے تراجم)

بارشوں کا موسم.....1985ء

(ہرمن ہیسے کی شاعری کے تراجم)

یادیں.....1996ء

Memories(پابلو نرودا کی خود نوشت کا ترجمہ)

لاشعور تک رسائی..... 1996ء

(یونگ کی کتاب "Approaching the Unconclous"
کا ترجمہ "لاشعور تک رسائی)

مناس..... 1996ء

(کرغزستان کی رزمیہ شاعری کا ترجمہ)

فرنینڈو پسیوا کی نظمیں..... 1997ء

(پرتگال کے قومی شاعر فرینڈو پیسوا کا ترجمہ)

بازیافت(دس شاعر سو نظمیں)..... 2002ء

(دنیائے ادب کے دس بڑے شاعروں پر تحقیقی مقالوں کے ساتھ ان کی نظموں کا ترجمہ)

سفر نامہ

دنیا کہیں جسے.....2005ء

(یو ایس اے، کینیڈا، لندن اور دبئی کا سفر)

مقالہ نگار: آپ کا آخری افسانوی مجموعہ 2013ء میں "بائسکوپ دن منظر عام پر آیا اس کے بعد تا حال کوئی افسانوی مجموعہ سامنے نہیں آیا۔اس محرک کی نشاندہی کیجئے۔

مصنف : میرا کارڈیک بائی پاس2014ء میں ہوا۔اس سے قبل غزل کی طرف توجہ قدرے زیادہ رہی۔ مستقبل قریب میں دو کتا ہیں اور ایک غزل کی کتاب آخری مراحل میں ہیں اور اشاعت کی منتظر ہیں۔

مقالہ نگار: کیا شاعری کے علاوہ افسانوں کے حوالے سے کوئی نئی تخلیق عصر حاضر میں سامنے آسکی ہے۔؟

مصنف: ڈاکٹر شفیق انجم کی مرتب کردہ کتاب جو کہ میرے چاروں افسانوی مجموعات میں سے منتخب افسانوں پر مبنی ہے۔"انور زاہدی کی کہانیاں " کے نام سے 2019ء میں فکشن ہاؤس لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

مقالہ نگار: آپ کی عالمی ادب پر بھی گہری نظر ہے۔اردو ادب کی صنف میں آپ کی خدمات قابل رشک ہیں۔پیشے کے اعتبار سے آپ طب کے ڈاکٹر ہیں۔یہ سارا سفر کیسے

طے ہوا؟

انسان میں بہت پوٹینشل ہوتا ہے۔وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو اپنے آپ کوDiscover کر لیتے ہیں۔ مجھے ادبی ماحول میسر آیا۔ادبی حلقے میں خاص طور پر ممتاز مفتی صاحب میرا Source of Inspiration ہیں۔اس سارے سفر میں ان کی تحریک میرے شامل حال رہی کہ وہ ہمیشہ نوجوان نسل کو لکھنے پر اکساتے Motivate کرتے ۔

مقالہ نگار: کیاآپ ادبی سفر میں کسی تنظیم کا حصہ رہے ؟

مصنف: منشایاد صاحب نے ایک ادبی تنظیم بنائی تھی۔جوکہ "رابطہ" کے نام سے مقبول ہوئی۔میں بھی اس تنظیم کا حصہ رہا۔منشایاد، منیر نیازی ، ممتاز مفتی سے خاص تعلق رہا۔حلقہ ارباب ذوق نے ادب کے فروغ میں خاص کردارا دا کیا۔

مقالہ نگار: ادبی منظر نامے کو آپ عصر حاضر کے حوالے سے کسی انداز میں دیکھتے ہیں ؟

مصنف: میں ہمیشہ پرامید رہتا ہوں۔سوشل میڈیا کے کردار سے گوکہ ادبی محافل میں وہ رمق نہیں رہی۔ آج بھی اچھی نظم اور غزل لکھی جا رہی ہے۔مگر افسانے سے متعلق میری رائے قدرے مختلف ہے۔شاید میرے خیال میں لکھا بھی زیا دہ جا رہا ہے۔اور اسے پڑھنے والے بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔صرف دائجسٹوں کے نام ہی لے لیں۔ذرائع ابلاغ کے جدید ذرائع کی موجودگی سے نئے لکھنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

مقالہ نگار: آپ کے افسانے کون کون سے ادبی جرائد کا حصہ رہے۔

مصنف: نقوش ، امروز

مقالہ نگار: آپ کے خیال میں فکشن کے موضوعات میں روایتی موضوعات کے حوالے سے جدید لکھنے والوں کے موضوعات میں فکری تنوع موجود ہے ؟

مصنف: افسانے کے مقابلے میں نظم یا غزل لکھنا قدرے آسانی ہے۔سوشل میڈیا کے توسط سے ہم پوری دنیا سے جڑے ہیں، ہمارا آج کا لکھاری پوری دنیا کے ادب سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔اگر کوشش کرے تو وہ واقفیت حاصل کر

سکتا ہے اور موضوعات میں جدت لاسکتا ہے۔بہر حال روایت سے جڑا رہناہی نئی روایت کو جنم دیتا ہے۔

مقالہ نگار: آپ کے موضوعات (بالخصوص افسانوں کے حوالے سے) شروع سے عصر حاضر تک کس طرح کے رہے اور ان کے پس منظر میں تخلیقی محرکات کیا کیا رہے؟

مصنف: :- جیسا کہ میرا پہلا افسانوی مجموعہ "عذاب شہرا پناہ" اپنےنام ہی سے اک عذاب ، شہر اورپناہ، وہایکAngry Young man کا Expiration تھا۔عمر بھی ایسی تھی کہ کالج سےجب فارغ التحصیل ہوئے۔جو حالات میرے سامنے تھے ان کا احوال تھا۔وہ میرا علامتی کہانیوں کا مجموعہ تھا۔یہ کہانیاں سوشیو پولیٹکل نوعیت کی کہانیاں تھیں۔

مقالہ نگار: آپ کے ہاں علامتی کہانیوں میں علامتوں کی نوعیت کیا ہے؟

مصنف: میرے ہاں علامتی کہانی پڑھنے کے بعد یہ احساس نہیں ہوتا کہ میں نے کیا پڑھا ہے۔بلکہ یہاں علامت استعارے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔اور کہانی ابلاغ کا باعث بنتی ہے۔جسے شاعری میں علامت ، استعارہ، اس میں خوبصورتی کا باعث بنتا ہے۔یہ میری کہانیوں کو مبہم نہیں بنائیں بلکہ اس میں دلکشی پیدا کرتی ہیں۔

مقالہ نگار: بعدازاں شائع ہونے والےافسانوی مجموعات میں کیاکوئی واضح تبدیلی سامنے آئی؟

مصنف: بعد میں میں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی۔اس کے پیچھے ممتاز مفتی صاحب کی ایک سجیشن کابہت عمل دخل ہے۔جس میں انہوں نے مجھے تنبیہ کی کہ انور زاہدی سیاست کو چھوڑواور کہانی لکھو۔ضیاءالحق کے دور کے بعد میں نے اپنے موضوعات سے سیاست نکال دی۔بعدازاں میرے موضوعات میں محبت، موت، بعدالطبیعات جیسے موضوعات ملتے ہیں۔موسم جنگ کا کہانی محبت کی، مندروالی گلی اور بائسکوپ دن تینوں مجموعوں میں یہی کہانیاں ہیں۔انہونی کاخوف، زندگی کی بے ثباتی، اچانک کسی کا چلے جانامیرے ہاں اہم موضوع ہے۔

مقالہ نگار: سیاسی موضوعات سے کنارہ کشی ایک اہم تبدیلی ہے جو کہ آپ کے افسانوں کے موضوعات میں جدت کا باعث بنی مگر آج بھی سیاسی موضوعات کے حوالے سے لکھا جارہا ہے۔ آپ کی فکر میں یہ تبدیلی کیسے اور کیوں کر رونما ہوئی؟

مصنف: کیوں ہمارے ہاں مزاحیہ شاعری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اور پوری دنیا میں سنی اور پسند کی جاتی ہے۔ لوگ اپنی پریشانیوں اپنے مسائل سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لطف اندوز ہوں، محظوظ ہوں اور اپنے مصائب کو بھول پائیں۔

مقالہ نگار: موت بطور اہم موضوع آپ کے افسانوں میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وضاحت کیجیے؟

مصنف: میرے افسانوی مجموعے "موسم جنگ کا، کہانی محبت کی" پر بات کرتے ہوئے ایک ممتاز افسانہ نگار دوست نے کہا تھا۔۔۔ معلوم نہیں ان کے افسانوں میں موت کا ذکر اس قدر کیوں ہے۔؟ ممکن ہے کہ ڈاکٹر ہونے کے ناطے یہ زندگی کے اس ہولناک رخ سے قریب ہوں اس حیات آب و گل میں شاید ہی کوئی ذی روح ایسا ہو گا جو زندگی کے اس المناک پہلو سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔

مقالہ نگار: کسی افسانہ نگار کے لیے اس کا اسلوب کس قدر اہمیت کا حامل ہوتا ہے؟

مصنف: بیشک اسلوب کی انفرادیت ہی ادیب کو اپنے ہم عصر ادباء سے ممتاز کرتی ہے۔ جیسے محبت کا ذکر مختلف شعراء کے ہاں مختلف انداز میں ملتا ہے۔ میر کے ہاں الگ انداز ہے، منیر نیازی، احمد فراز اور اقبال کے ہاں الگ الگ پیرائے ہیں۔ الگ الگ اسلوب ہے، جس سے ہم ان کے کلام میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

مقالہ نگار: آپ کا اسلوب کن وجوہات کی بدولت علامتی طرز تحریر سے بیانیہ طرز تحریر کی طرف مائل ہوا۔؟

مصنف: ضیاء کا مارشل لاء تھا، علامتی انداز اپنایا گیا۔ بعد ازاں سر کے بالوں میں چاندی چمکنے لگی تو زندگی نے اپنے اور پرت روشن کیے۔۔ کہانی کا بھی رنگ بدلا۔۔۔ محبت۔۔۔ موت اور مابعد الطبیعات جیسے موضوعات در پیش ہوئے۔۔ مندر والی گلی دیکھی۔

لغات:

۱۔وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتب خانہ، لاہور، ۲۰۰۳ء،

۲۔Qaumi English Urdu Dictionary,www.nlbp,gov.pk

۳۔ابو اعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء،

۶۔انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء،

رسائل و جرائد:

۱۔رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب ۱۹۹۰ء انتخاب نثر، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۱۹۹۱ء،

مضامین:

۱۔صباء اکرام، نیا افسانہ چند صورتیں، مشمولہ اردو افسانے میں جدیدیت، زین پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۱ء،

۲۔ مبین مرزا، اکیسویں صدی میں جدید افسانے کے نقوش، مضمون مشمولہ، ادب سلسلہ پبلیکیشنز، ۲۰۱۵ء، دہلی

۳۔ محمد حمید شاہد، اردو افسانہ: بنیادی مباحث، مشمولہ، ایم اے فاروقی، افسانے کے مباحث، بک ٹائم، کراچی، ۲۰۱۷ء

مقالہ جات:

۱۔صفیہ عباد، "رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ"، مقالہ برائے ایم فل، اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ،اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

۲۔عجب خان، "انور زاہدی کی ادبی خدمات"، مقالہ برائے ایم فل، اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

ویب گاہیں:

1.http.//ur,m wiki pedia.org/wiki

2.Qaumi English Urdu Dictionary,www.nlbp,gov.pk

3.https://www.youtube.com/watch?v=xAdxsaxklOg

4.https://www.youtube.com/watch?v=GZwhRC4DBQM

5. https://www.youtube.com/watch?v=I5fKDhkVZmM&t=36s